2'50

ماہنامہ کھلونا

فروری 1973

فروری
۱۹۷۳

۲۹۹ واں پرچہ
پچیسواں سال

نگراں : یوسف دہلوی
مدیر : الیاس دہلوی
مدیران اعزازی : یونس دہلوی
ادریس دہلوی

قیمت سالنامہ :
۲ روپے ۵۰ پیسے

عام شمارے کی قیمت : ۷۵ پیسے
سال بھر کی قیمت : ۹ روپے
(مع رجسٹری خرچ سالنامہ)

سال نامہ
کھلونا
نئی دہلی
فروری
۱۹۷۳
نگراں : یوسف دہلوی
مدیر : الیاس دہلوی
مدیران اعزازی: یونس دہلوی
ادریس دہلوی
۲۹۹ واں پرچہ
پچیسواں سال
عام شمارے کی قیمت : ۷۵ پیسے
سال بھر کی قیمت : ۹ روپے
(مع رجسٹری خرچ سال نامہ)
قیمت سال نامہ :
۲ روپے ۵۰ پیسے

اِن کے علاوہ : ★ تصویری پہیلیاں ★ دل چسپ کھیل
★ اِنعامی تصویر ★ تصویری کارٹون ★ نیا مقابلہ
★ بے تکی کارٹون ★ اِنعامی مقابلے اور بہت سی دل چسپیاں

مطبوعہ : امپیریل پریس، دہلی   ٹائٹل کے صفحات : نوبل پرنٹرز، دہلی

مالکان : شمع میگزین   طابع وناشر : یونس دہلوی

میرا خرگوش

تصاویر: اشوک کمار

دیکھو! میرا مونہہ کتنا بڑا ہے

کیا مجھ سے بھی زیادہ؟

تصاویر: اے ایل سعید

چوری....

. . . سزا

تصاویر: بی ایم چوپڑہ

تصویر: ایم ایل مہتہ

۔۔۔۔اور تال

تصویر: پی سیتارام

کیا —— آج اسکول کی چھٹی ہے؟

بچپن بچپن

کرشن چندر

ہمارے بچپن کا شہر، روم کے شہر کی طرح سات پہاڑیوں پر بسا ہوا تھا۔ ایک پہاڑی کے نیچے ایک بہت خوب صورت پہاڑی چشمہ تھا۔ یہاں ایک عمدہ باؤلی بنی ہوئی تھی۔ چشمے سے لوگ گھروں کے لئے پانی بھر کے لے جاتے تھے۔ اور نیچے کی باؤلی میں نہاتے تھے۔ یہ جگہ ڈنگس کی باؤلی کہلاتی تھی۔

اتوار کے دن ہم یہاں نہانے کے لئے آیا کرتے تھے ماں جی بہت بگڑتی تھیں۔ جب گھر میں غسل خانہ موجود ہے

"دیکھ لو دودھ والا ہی نہیں، ممی بھی دودھ میں پانی ملا رہی ہیں!"

نہلانے کے لئے نوکر چاکر موجود ہیں، تو سب کے ساتھ باؤلی پر جاکر نہانے کی کیا ضرورت ہے؟ — اب ہم انہیں کیسے سمجھاتے کہ سب کے ساتھ نہانے میں جو مزا ہے وہ اکیلے نہانے میں نہیں ہے۔ پھر بچوں کا کہنا آج تک کسی ماں نے مانا ہے؟

ڈونگس کی باؤلی سے آدھے میل کی دوری پر دریا بہتا تھا۔ پہاڑی چٹانوں سے ٹکراتا ہوا۔ بڑے بڑے پتھروں کے اوپر سے لڑھکتا ہوا مشرق سے مغرب کی طرف بہتا تھا۔ سردیوں میں اس دریا کی روانی بہت کم ہو جاتی۔ اور یہی دریا ایک کے بجائے کئی دھاراؤں میں بٹ جاتا۔

ایک روز جب ہم ڈونگس کی باؤلی پر نہانے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ کسی نے صلاح دی۔ کہ دریا پر چل کے نہانا چاہیئے۔ آج تک ہم کبھی دریا میں نہائے نہ تھے۔ عمر بھی چھوٹی تھی یہی کوئی سات آٹھ سال کے رہے ہوں گے۔ ڈر بھی لگتا تھا۔ شاید ڈوب جائیں گے۔ ڈوب جانے سے زیادہ اس بات کا صدمہ تھا، کہ بعد میں ماں جی روئیں گی۔

ایک بڑے سے لڑکے نے میرا چہرہ دیکھ کر کہا۔ ڈرو مت۔ دریا بہت سی دھاراؤں میں بٹا ہوا ہے۔ کسی چھوٹی سی دھارا میں چل کے نہائیں گے۔ سب لڑکے اس کے ساتھ چل دیتے ہم بھی۔ میرا چھوٹا بھائی بھی۔

دریا میں نہانے کا بہت مزا آیا۔ پانی کی دھار بڑے بڑے پتھروں کو پھلانگتی ہوئی اوپر سے آتی تھی۔ اور شور مچاتی ہوئی دور تک نیچے چلی جاتی تھی۔ اوپر سے بڑی بڑی لہریں بل کھاتی ہوئی آتیں اور نیچے جاکر شانت ہو جاتیں ہمیں تیرنا نہیں آتا تھا۔ مگر ایک لڑکے نے بتایا تیرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے آپ کو لہروں کی اچھال کے سپرد کر دو۔ وہ تمہیں خود سے بہاتی ہوئی اوپر سے نیچے لے جائیں گی۔ جہاں پانی شانت ہے۔ ایسا ہی کیا گیا۔ دیر تک نہاتے رہے۔ اور لہروں کے ساتھ دھومیں مچاتے ہوتے اوپر سے نیچے آتے گئے۔

مگر ایک دفعہ جو لہروں کے بہاؤ کے ساتھ جانے میں ذرا دیر کر دی تو گھٹنے دو تین چار بار پتھروں سے ٹکرا گئے۔ درد سے بلبلا کر پانی سے باہر نکلے تو دیکھا کہ دونوں گھٹنوں سے لہو بہہ رہا ہے۔ دریا کے کنارے کی ریت اور مٹی مل مل کر لگائی۔ مگر لہو بند نہ ہوا۔ گھر پہنچے۔ تو ماں جی نے پکڑ لیا "کہاں گئے تھے؟"

پہلے تو جھوٹ بولا۔ مگر جب جھوٹ لے بولنے سے کام

(آگے صفحہ ۱۲۱ پر)

علامہ اقبال مرحوم نے ایک مدت تک بچوں کے لیے نظمیں لکھیں ہیں۔ اُن میں سے بعض درسی کتب میں شامل ہو چکی ہیں مثلاً "دعا"، "ایک پہاڑ اور گلہری"، "ایک گائے اور بکری" وغیرہ وغیرہ۔ جو نظمیں ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں اُن میں "گھوڑوں کی مجلس" اور "شہد کی مکھی" کھلونا کے دو گذشتہ سال ناموں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس سلسلے کی تیسری نظم "جہاں تک ہو سکے نیکی کرو" موجودہ سال نامے کے ذریعے سے کھلونا پڑھنے والے بچوں کی نذر کی جا رہی ہے۔

(جگن ناتھ آزاد، سرینگر)

جہاں تک ہو سکے نیکی کرو

علامہ اقبال (مرحوم)

کہتے ہیں ایک سال نہ بارش ہوئی کہیں ۔۔۔ گرمی سے آفتاب کی تپنے لگی زمیں
تھا آسمان پر نہ کہیں ابر کا نشاں ۔۔۔ پانی ملا نہ جب تو ہوئیں خشک کھیتیاں
لالے پڑے تھے جان کے ہر جان دار کو ۔۔۔ اُجڑے چمن، ترستے ترستے بہار کو
مُونہہ تک رہی تھی خشک زمیں آسمان کا ۔۔۔ اُمید ساتھ چھوڑ چکی تھی کسان کا
بارش کی کچھ اُمید نہ تھی اُس غریب کو ۔۔۔ یہ حال تھا کہ جیسے کوئی سوگوار ہو
اِک دن جو اپنے کھیت میں آکر کھڑا ہوا ۔۔۔ پَودوں کا حال دیکھ کے بے تاب ہو گیا
ہر بار آسماں کی طرف دیکھتا تھا وہ ۔۔۔ بارش کے انتظار میں گھبرا رہا تھا وہ
ناگاہ ایک ابر کا ٹکڑا نظر پڑا ۔۔۔ لاتی تھی اپنے ساتھ اُڑا کر جسے ہَوا
پانی کی ایک بُوند نے تاکا اِدھر اُدھر ۔۔۔ بولی وہ اُس کسان کی حالت کو دیکھ کر
ویران ہو گئی ہے جو کھیتی غریب کی ۔۔۔ ہے آسمان پر نظر اُس بد نصیب کی!
دِل میں یہ آرزو ہے کہ اس کا بھلا کروں ۔۔۔ یعنی برس کے کھیت کو اُس کے ہَرا کروں
بُوندوں نے جب سُنی یہ سہیلی کی گفتگو ۔۔۔ ہنس کر دیا جواب کہ اللہ رے آرزو!
تُو اِک ذرا سی بُوند ہے اتنا بڑا یہ کھیت ۔۔۔ تیرے ذرا سے نَم سے نہ ہوگا ہَرا یہ کھیت
تری بساط کیا ہے کہ اُس کو ہَرا کرے ۔۔۔ ہو خود جو ہیچ کیا وہ کسی کا بھلا کرے!
سن بُوند نے مگر یہ بگڑ کر دیا جواب ۔۔۔ کہہ دی وہ بات جس نے کیا سب کو لاجواب
مانا کہ ایک بُوند ہوں، دریا نہیں ہوں میں ۔۔۔ قطرہ ذرا سا ہوں کوئی چھینٹا نہیں ہوں میں
مانا کہ میرا نم کوئی دریا کا نم نہیں ۔۔۔ ہمت تو میری بحر کی ہمت سے کم نہیں
نیکی کی راہ میں کبھی ہمت نہ ہاریے ۔۔۔ مقدور ہو تو عمر اِسی میں گزاریے

قُربان اپنی جان کروں گی کسان پر
کیا لُوں گی میں ٹھہر کے یہاں آسمان پر

نیکی کے کام سے کبھی رُکنا نہ چاہیئے
اس میں کسی کے ساتھ کی پروا نہ چاہیئے

یُوں ہی چلی یہ کہہ کے روانہ ہوئی وہ بُوند
بُوندوں کی انجمن میں یگانہ ہوئی وہ بُوند

اِک ٹپ سے اس کی ناک پہ وہ بُوند گر پڑی
سُوکھی ہوئی کسان کے دِل کی کلی کھلی

دیکھا سہیلیوں نے تو حیران ہو گئیں
ہمّت کے اس کمال پہ کی سب نے آفریں!

بولیں کہ چاہیئے نہ سہیلی کو چھوڑنا
اچھا نہیں ہے مونھ کو رفاقت سے موڑنا

ساتھی کے ساتھ سب کو برسنا ضرور ہے
گر ہم نہ ساتھ دیں تو مُروّت سے دُور ہے

یہ کہہ کے ایک ساتھ وہ بُوندیں رَواں ہوئیں
چھینٹا سا بن کے کھیت کے اوپر برس گئیں!

پھر سامنے نظر کے بندھا آس کا سماں
تھی آس، آس پاس گیا، یاس کا سماں

اُجڑا ہوا جو کھیت تھا آخر ہرا ہوا
سارا یہ ایک بُوند کی ہمّت کا کام تھا

دیکھی گئی نہ اُس سے مصیبت کسان کی
بیتاب ہو کے کھیت پہ اُس کے برس گئی

ننھی سی بُوند اور یہ ہمّت، خدا کی شان!
یہ فیض، یہ کرم، یہ مروّت، خدا کی شان!

چاچا نہرو نے سینما دیکھا

خواجہ احمد عباس

چاچا نہرو کے بچپن میں سینما نہیں تھا ——— اُن کی طالب علمی کے زمانے میں (جو انہوں نے انگلستان میں گزارا) پڑھے لکھے لوگوں میں تھیئٹر بہت مقبول تھا۔ خاموش فلمیں جو شروع ہی ہو رہی تھیں اَن پڑھ لوگ اور بچے ہی زیادہ پسند کرتے تھے۔

جب وہ بیرسٹری پڑھ کر ہندوستان واپس آئے اور فلمیں ہندوستان میں بھی مقبول ہونے لگیں تو سیاست کے ہنگاموں نے ان کو اتنی فرصت ہی نہیں دی کہ وہ سینما دیکھنے کی عادت ڈال سکیں۔

ایک خط میں انہوں نے مجھے لکھا تھا: "جیسا کہ تم جانتے ہو، میں بہت کم سینما جاتا ہوں۔ سال بھر میں اوسطاً دو فلمیں ہی دیکھ پاتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں فلموں کو ناپسند کرتا ہوں بلکہ اس لئے کہ مجھے سینما دیکھنے کا وقت نہیں ملتا۔"

وہ فلمیں کم دیکھتے تھے لیکن سینما کو عوام کی نہ صرف تفریح بلکہ تعلیم کا ایک بہت بڑا ذریعہ سمجھتے تھے۔ بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کے برخلاف ان کو نہ ہندوستانی فلموں سے کوئی بنیادی تعصب تھا، نہ ہندوستانی فلم سٹاروں سے۔

چاچا نہرو کو ہر آرٹ اور ہر کلا سے لگاؤ تھا۔ ہر

قسم کے کلاکاروں کی وہ عزت کرتے تھے۔
مدراس کی مشہور کلاسیکل گانے والی ایم۔ایس سبالکشمی کے گانوں کو وہ بہت شوق سے سنتے تھے۔ یہ چاچا نہرو کی قدردانی ہی تھی کہ سبالکشمی کو اقوامِ متحدہ (نیویارک) میں اپنے گانوں کا پروگرام پیش کرنے کے لئے بلایا گیا۔ وہ اودے شنکر اور منیکا کے کلاسیکل ناچ دیکھنا پسند کرتے تھے اور روی شنکر کا ستار سن کر بہت خوش ہوتے تھے۔

اس طرح وہ راج کپور اور دلیپ کمار سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ان دو نوجوان فلم سٹاروں کی دوستی ہندوستانیوں کی ایکتا اور یگانگت کی ایک روشن مثال ہے۔ ایک بار روس کے بارے میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے ہنس کر یہ بھی کہا تھا کہ "روس کے عوام میں میں خاصا مقبول ہو گیا ہوں تقریباً اتنا ہی مقبول جتنا "آوارہ" فلم چلنے کے بعد راج کپور مقبول ہو گیا ہے۔"

جب سے وہ پرائم منسٹر بنے تھے، چاچا نہرو دیش کے کاموں میں اتنے مصروف رہتے تھے کہ ان سے یہ کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ آپ میری فلم دیکھنے کے لئے وقت نکالئے۔ پھر بھی جب اٹھارہ برس پہلے میری فلم "منا" (جس کی کہانی ایک چھوٹے بچے کے بارے میں تھی) بن کر تیار ہوئی تو میرا جی چاہا کہ کسی طرح چاچا نہرو اسے دیکھ لیں۔ میں نے ہمت کر کے ان کو خط لکھا کہ کسی دن آپ کو دو گھنٹے کی فرصت ہو تو میں یہ فلم آپ کو دکھانے دہلی لے آؤں۔ چوتھے یا پانچویں دن ان کے سکریٹری کا خط آ گیا کہ فلاں تاریخ کو رات کے نو بجے جواہر لال نہرو جی ہماری فلم "منا" راشٹرپتی بھون کے چھوٹے سنیما گھر میں دیکھیں گے۔ ہماری خوشی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ فوراً ہم نے دہلی جانے کی تیاری شروع کر دی۔ فلم میں کام کرنے والے کئی آرٹسٹوں (مثلاً من موہن کرشن، اچلا سچدیو اور سات برس کے ننھے رومی) کو بھی ساتھ لے لیا۔ میرے ادیب دوست اندر راج آنند بھی میرے اصرار کرنے پر تیار ہو گئے اور ہمارا یہ قافلہ ایک دن پہلے دہلی پہنچ گیا۔

ہم راشٹرپتی بھون ساڑھے آٹھ بجے ہی پہنچ گئے۔ اور چاچا نہرو کا سواگت کرنے کے لئے لائن لگا کر تیار ہو گئے معلوم ہوا کہ وہ کافی اہم مہمانوں کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور پھر کھانا کھانا ہے۔ اس کے بعد وقت ہوا تو سنیما دیکھنے آ سکیں گے، ورنہ یہ پروگرام ملتوی۔ گھبراہٹ اور کھسیاہٹ سے ہماری (اور خاص کر میری) بڑی بری حالت تھی۔ بار بار خیال آتا تھا کہ اگر چاچا نہرو نہ آئے تو کیا ہوگا؟

نو بج کر چند منٹ ہی ہوتے تھے کہ چاچا نہرو اور ان کے ساتھ اندرا جی اور ان کے کتنے ہی مہمان سب آ گئے۔
مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے چاچا نہرو نے کہا "بھئی ہم ان سب کو بھی لے آئے ہیں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"
میں نے ان کو یقین دلایا کہ ان کے سب مہمان ہمارے سر آنکھوں پر۔ پھر میں نے اپنے ساتھیوں کا تعارف کرایا اور آخر میں ننھے رومی کا یہ کہہ کر کہ "یہ اس فلم کا ہیرو ہے۔"
چاچا نہرو رومی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ رومی

بھی اُس روز چوڑی دار پاجامہ اور کالی شیروانی پہنے ہوئے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا جب چاچا نہرو اُس کی اُنگلی پکڑ کر اندر چلے۔ (آج تو وہ نہ صرف شادی کر چکا ہے، بلکہ شاید اُس کے کئی بچّے بھی ہیں)

چاچا نہرو کرسی پر بیٹھ گئے۔ اُن کے برابر میں اندرا جی تھیں، مجھے بُلا کر انہوں نے دوسری طرف کرسی پر اپنے پاس بٹھایا اور کان میں آہستہ سے کہنے لگے "بھئی، میں یہ پہلے سے کہہ دوں کہ اگر مجھے نیند آنے لگی تو میں چلا جاؤں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ دیکھیں کہ فلم چل رہی ہے اور میں خرّاٹے لے رہا ہوں۔"

میں یہ سُن کر پریشان سا ہو گیا۔

میری گھبراہٹ دیکھ کر وہ بولے "بھئی بات یہ ہے کہ میں نے جیل کی زندگی میں عادت ڈال لی تھی کہ جیسے ہی روشنی بجھائی جائے نیند آجاتی ہے۔"

میں بڑا گھبرایا۔ اب کیا کیا جائے کہ چاچا نہرو بیچ فلم میں نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ میں فلم سٹارٹ کرانے کے بہانے سے باہر آیا اور رومی کو اشارے سے پاس بُلایا۔ اُس کے کان میں کہا "دیکھو بیٹا، چاچا نہرو کے پیروں میں قالین پر بیٹھ جاؤ اور جیسے ہی وہ اٹھنے کا ارادہ کریں تو اُن کے پیر پکڑ کر رونے لگنا۔ جانے نہ دینا۔"

رومی آ کر چاچا نہرو کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ فلم شروع ہوئی، میں چاچا نہرو کے برابر کی کرسی پر بیٹھ گیا مگر میری نگاہیں فلم کے پردے پر نہیں تھیں۔ میں ٹکٹکی باندھے چاچا نہرو کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جو بڑے غور اور دلچسپی سے فلم دیکھ رہے تھے۔ ایک بار کسی سین کے ڈائیلاگ پر ہنسے اور "بہت اچھا!" کہہ کر میری طرف دیکھا تو مجھے اپنی طرف ہی دیکھتا پایا۔

بستر کے اسپرنگ دار گدّے کا نیا استعمال

کہنے لگے "فلم دیکھو۔ میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟"
میں نے آہستہ سے کہا "دیکھ رہا ہوں کہ آپ کو نیند تو نہیں آرہی ہے۔"

اس پر سنیما کی دھندلی روشنی میں بھی میں نے اُن کے چہرے پر ایک مُسکراہٹ ابھرتے ہوئے دیکھی، جس کا مطلب میں نے اُس وقت نہیں سمجھا۔ پھر انہوں نے کہا: "آرام سے بیٹھو اور فلم دیکھو ــــ اگرچہ تم نے ہی اسے بنایا ہے۔" اس کے بعد انہوں نے رومی کے سر کو تھپکا اور پھر دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔

پھر وہ سین آیا جب من موہن کرشن (جو اِس فلم میں ایک درجن بچّوں کا باپ ہے) نے اپنے بچّوں کی پوری پلٹن سے پوچھا "بچّو، بتاؤ ہندوستان کا راشٹرپتی کون ہے؟"
سب بچّے ایک دوسرے کا مونہہ دیکھنے لگے پھر ایک بڑے بچّے نے اٹکتے اٹکتے بتایا "میرے خیال میں پنڈت جواہر لال نہرو ہیں۔"

"غلط"۔ اُس کے باپ نے کہا "پنڈت جواہر لال نہرو

ہمارے پردھان منتری ہیں، راشٹرپتی بابو راجندر پرشاد ہیں ——"

پھر باپ نے پوچھا " اچھا بچو بتاؤ، آوارہ فلم کا ہیرو کون ہے ؟"

اب سب بچوں نے ہاتھ اٹھا کر جوش سے بیک وقت آواز بلند کی " راج کپور ! راج کپور !"

یہ سین دیکھ کر چاچا نہرو بہت ہنسے، بہت ہنسے اور میری پیٹھ تھپ تھپائی۔ پھر مجھ سے دھیرے سے کہا: " بعد میں یاد دِلانا۔ میں ایسا ہی ایک واقعہ سُناؤں گا "

اور پھر "مُنّا" اور اس کی ماں کا مِلاپ ہوگیا۔ فلم ختم ہوگئی۔ چاچا نہرو آخر تک بیٹھے رہے اور بڑی دلچسپی سے فلم دیکھتے رہے۔

جب روشنیاں ہوئیں تو چاچا نہرو مجھ سے ہنس کر کہنے لگے "کیا تم سمجھتے تھے میں سچ مچ اتنا بدتمیز ہوں کہ فلم کے بیچ سے اُٹھ جاؤں گا ؟"

میں نے کھِسیانا ہوکر کہا " میں بڑا بے وقوف ہوں جو آپ کا مذاق نہیں سمجھا، مگر بڑا خوش قسمت ہوں کہ آپ نے میری پوری فلم دیکھی "

پھر چاچا نہرو نے "مُنّا" کے ننھے ہیرو رومی کی پیٹھ تھپ تھپائی اور بہت شاباش دی۔ پوچھنے لگے " دہلی میں کیا کیا دیکھا ؟"

وہ بھی بڑا تھا۔ کہنے لگا " ابھی تو آپ کو دیکھا ہے بس "

چاچا نہرو اُس کو بتانے لگے کہ دہلی میں دیکھنے کے قابل کیا کیا جگہیں ہیں —— لال قلعہ، جامع مسجد، جنتر منتر قطب صاحب کی لاٹ . . . .

" اور . . . . اور . . . . "

رومی نے کہا " اور پردھان منتری جی کا گھر !"

چاچا نہرو نے میری طرف مڑ کر کہا " بھئی اس بچے کو ہمارا گھر بھی دکھاؤ "

میں نے کہا " یہ آپ کا گھر آپ کی موجودگی میں دیکھنا چاہتا ہے "

اور مَن موہن کرشن نے ہاتھ جوڑ کر کہا " پنڈت جی، آپ کے لئے تو ہم سب بچے ہیں "

پنڈت جی نے مسکرا کر اندرا جی کی طرف دیکھا اور پوچھا " کیوں بھئی۔ انڈے ہیں گھر میں ؟ اتنے لوگوں کے ناشتے کا انتظام ہوجائے گا ؟"

انہوں نے کہا " ضرور ہوجائے گا "

اور پھر تو ہم کو صبح سویرے چاچا نہرو کے گھر ناشتے پر جانے کی خوشی میں رات بھر نیند نہیں آئی۔

اگلے دِن ناشتے کی میز پر میں نے چاچا نہرو سے کہا " کل رات آپ نے فرمایا تھا کہ یاد دلانا ایک واقعہ سُناؤں گا "

اس پر چاچا نہرو نے اپنے بچپن کا واقعہ سُنایا۔ جب وہ انگلستان کے ایک اسکول میں پڑھتے تھے، تو اُن ہی دِنوں انگلستان میں لبرل پارٹی کی نئی حکومت قائم ہوئی تھی —— کلاس ماسٹر نے لڑکوں سے پوچھا " نئی حکومت کے منسٹروں کے نام بتاؤ " سب خاموش رہے۔ صرف ایک لڑکا صحیح جواب دے سکا۔

چاچا نہرو نے یہ نہیں بتایا کہ اس لڑکے کا نام جواہر لال نہرو تھا۔

انہوں نے صرف اتنا کہا " وہ ایک ہندوستانی لڑکا تھا ——"

■ ■

رئیس اعظم

عصمت چغتائی

ہماری ایک نانی امّاں تھیں۔ ویسے نانی امّاں تو ہر ایک کی ہوا کرتی ہیں مگر ہماری نانی امّاں کا تو بس جواب نہ تھا۔ گھر میں نوکروں کی ریل پیل تھی۔ ہل کے پانی پینے کی بھی ضرورت نہ تھی اور نانی امّاں پانی تو بہت پیتی تھیں مگر ہلنے جلنے سے انہیں انتہائی نفرت تھی۔ وہ عموماً برآمدے میں رہا کرتی تھیں۔ نانیاں عموماً برآمدوں ہی میں رہنا پسند کرتی ہیں تاکہ آسانی سے کمروں پر بھی نظر رکھ سکیں اور صحن پہ

بھی۔ کسی ہوئی نواڑ کی پلنگڑی پر بیٹھی ہوتی وہ تمام نوکروں اور بچّوں کی نگہبانی کیا کرتیں۔ اُن کی آواز بڑی پاٹ دار تھی کوئی ذرا بھی خلافِ قاعدہ بات کرتا تو وہ انتہائی دبنگ آواز میں ڈپٹنے لگتیں۔

"کیوں رے خدائی خوار پھر وہی گنوار پن "

پھر اُس کے امّاں ابّا کی طلبی ہوتی۔ جی بھر کے اُن کی ٹانگ گھسیٹی جاتی۔ باری باری دونوں کو مجرم ٹھیرایا جاتا۔ غریب ماں باپ اپنی قسمت کے سر الزام تھوپ دیتے۔ یہ سلسلہ اُس وقت تک چلتا رہتا جب تک دوسرا مجرم ہاتھ نہ آجاتا اور نانی امّاں اس کی مرمّت کرنے لگتیں۔

جب نانی بچّوں، نوکروں اور ان کے رشتہ داروں کو ڈانٹ چکتیں تو ایک دم تھک کر سو جاتیں اور اتنے خوفناک خراٹے لیتیں کہ در و دیوار لرزنے لگتے۔ پھر اچانک آنکھ کھل جاتی اور وہ پہلے سے زیادہ چڑچڑی ہو جاتیں۔

اُن کی سخت گیری کی وجہ سے اُن کا گھر آئینہ کی طرح چمکتا رہتا۔ نوکر نہایت قاعدے کے اور بچّے بے حد مہذّب اور خاموش طبیعت کے تھے۔ اُن کا کُتّا تک بڑے ہولے سے کبھی جاگ جاتا تو بھونک دیتا۔ ورنہ جیسے ہی نانی امّاں کی آنکھ لگتی وہ بھی اُونگھ جاتا۔ لوگوں کا کہنا تھا ان کی مُرغیاں اور کبوتر بھی بڑے خاموش طبیعت اور مسکین تھے۔

نانی امّاں کے ہاں جتنا سگھڑاپا اور نفاست تھی اس کے بالکل اُلٹ ہمارے ہاں اُتنا ہی اُودھم اور لااُبالی پن چھایا رہتا تھا۔ امّاں کی آواز نانا میاں مرحوم کی طرح نہایت سوئی ہوئی تھی۔ نانی امّاں کی پالی ہوئی تھیں۔ کبھی کسی پر دھونس جمانے میں کامیاب نہ ہو پائیں۔ نہ اُن کے نوکر اُن کے قابو میں نہ اُن کے بچّے اُن کے بس میں۔ جہاں کے انسان شُتر بے مہار ہوں وہاں جانور بھی بدتمیز اور خودسر ہو جاتے ہیں۔ نوکر بیٹھے ہنسی ٹھٹول کیا کرتے، بچّے گھمسان مچائے رکھتے اور جانور من مانی کیا کرتے۔

جمعہ کے روز بچّوں کو نانی کے سلام کے لئے اُن کے ہاں جانا لازمی تھا۔ اُس دن امّاں ہلکان ہو جاتیں۔ صبح سے بچّے مانجھ دھو کر چمکائے جاتے۔ لڑکوں کو اچکن ٹوپی پہنائی جاتی اور لڑکیوں کی کس کس کے چوٹیاں باندھی جاتیں۔ پھر طرح طرح کی دھمکیاں اور رشوتیں دے کے انہیں بھیجا جاتا۔ نانی امّاں کے برآمدے میں پہنچ کر سب باری باری سلام کرتے۔ نانی ایک ایک کو قریب بُلا کر بڑی سختی سے معائنہ کرتیں۔ کسی کا بٹن تو نہیں ٹوٹا ہے۔ کانوں کے پیچھے میل کی پپڑیاں تو نہیں۔ ناخن بڑھے ہوئے تو نہیں۔

ہر جمعہ نانی امّاں سب کا نام پوچھتیں اور بھول جاتیں، پھر دوسرے جمعہ کو نئے سرے سے پوچھتیں۔ اگر کوئی بھی بات خلافِ مرضی ہو جاتی تو نانی امّاں اس کی کھنچائی شروع کر دیتیں۔ سلامی اور معائنہ کے بعد نہایت سلیقہ مند نوکرانیاں سینی میں مٹھائی، دالموٹ اور پھل لے کر آتیں اور نانی امّاں اپنے ہاتھ سے سب کو بانٹتیں۔ اگر ایک بھورا بھی کسی سے قالین پر گر جاتا تو قیامت آجاتی۔ فوراً نوکرانیوں کی فوج جھاڑن برش لے کر دوڑی آتی۔ اتنی لے دے مچتی کہ مہمان حواس باختہ ہو کر اور گراتے۔ لڈو ہاتھ سے چھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ انہیں سمیٹنے کی کوشش میں جوتوں سے مسل کر قالین پر پلاسٹر ہو جاتا اور نانی امّاں کو دل کا دورہ پڑنے لگتا اور سب وہاں سے لشتم پشتم واپس آجاتے۔

خاصی مزے دار چیزیں کھانے کو ملتیں مگر سر پر ایسی تلوار سی لٹکی رہتی کہ بالکل پتہ نہ چلتا کہ کیا کھا رہے ہیں۔ سارا وقت تو احتیاط کرتے گزر جاتا۔ مزہ لینے کی مہلت ہی کب

ملتی تھی۔ نانی اماں کا سارا خاندان لحاظ کرتا تھا۔ ایک تو اس لئے کہ وہ واقعی سب کی بزرگ تھیں۔ دوسرے نانا میاں مرتے وقت ساری جائداد اُن کے نام کر گئے تھے اور وہی سب سیاہ و سفید کی مالک تھیں۔ اُن سے کوئی بگاڑ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب بھی کسی نے چُوں چرا کی اور نانی اماں نے دھمکی دی کہ ساری اللہ نام پہ دے دیں گی۔

جائیداد واقعی بہت تھی اور نانی اماں کافی عمر کو پہنچ گئی تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا بس اب آنکھوں کی سُوئیاں رہ گئی ہیں اور اب کا جاڑا، برسات یا گرمی نہیں جھیل پائیں گی۔ مگر نانی اماں کتنے سال سے جاڑا، گرمی، برسات مزے سے جھیل رہی تھیں اور قطعی اللہ کو پیاری ہونے کا پروگرام نہ تھا۔ وہ اب بانوے کی تھیں اور آپریشن کے بعد اچھی طرح دیکھنے بھی لگی تھیں۔ اُن کے طور طریق دیکھ کر یقین ہو جاتا تھا کہ اتنے ہی سال اور کھینچ جائیں گی۔ اُن کے بیٹے بیٹیاں بوڑھے ہو رہے تھے۔ کئی تو ان کے ہم عمر لگنے لگے تھے۔ پوتے نواسے خود نانا بننے جا رہے تھے۔ اُمید پہ دنیا قائم ہے۔ سب اسی لئے ان کی دل جوئی کیا کرتے تھے بلکہ ان کی خاطر مدارات میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے ایک دوسرے کی کاٹ کرنے کے لئے نانی اماں کو بھڑکایا۔ مگر وہ بجائے کھینچنے کے اُسی کی طرف جُھک جاتیں جس کی اُن سے بُرائی کی جاتی۔ وہ سمجھتی تھیں بُرائی کی ذمہ دار وہ خود ہیں اُن کی بے توجہی اور لاپرواہی کی وجہ سے یہ عیب پیدا ہوا ہے۔ اور جب وہ کسی کی پرواہ کرنا شروع کرتیں تو اُن پر جنون ساطاری ہو جاتا۔ بس پیچھے پڑ جاتیں اُس کے۔ راہ راست پر لانے کے لئے وہ پہلے تو واویلا مچاتیں، کوستیں، گالیاں دیتیں۔ پھر رشوت سے کام نکالتیں۔ اس طرح بجائے نقصان کے عموماً

یہ ورزش سکھانے کا آسان طریقہ ہے

مجرم کا فائدہ ہو جاتا۔ اُس نے قصور نہ بھی کیا ہوتا تو سر جھکا کر رونی صورت بنا کر معافی مانگ لیتا۔

تب تو لوگوں کو ترکیب سوجھ گئی۔ باقاعدہ سازش کر کے لوگ ضرورت مند کی بُرائی کرتے اور نانی اماں چکمہ میں آ کر واویلا شروع کر دیتیں۔ مثلاً جب ماموں کو ولایت جانے کے لئے روپے کی ضرورت ہوئی تو نانی اماں نے قطعی انکار کر دیا۔ سات سمندر پار مُوئے فرنگیوں کے دیس میں وہ ہرگز اپنے دل کے ٹکڑے کو نہیں بھیجیں گی۔ بہت منت سماجت کی، سمجھایا مگر ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ پھر کسی کو ترکیب سوجھی چچا جان نے ایک دن نہایت رونی صورت بنا کر بڑی راز داری کے انداز میں کہا:

"پھپھو سلیم میاں تو ہاتھ سے گئے۔"

"خیر تو ہے بیٹا کیا ہوا۔ کیا گھوڑے پر سے گر پڑا؟"

نانی اماں ماتم کرنے لگیں۔

"کاش گھوڑے پر سے گر جاتا
اور اس کی مٹی عزیز ہو جاتی۔"

"ہے ہے تو پھر کیا ہوا؟"

"کیا بتاؤں پھپھو، بس جی چاہتا ہے سنکھیا کھا کے سو رہوں۔" چچا جان نے خیالی آنسو پونچھے۔

"اے لڑکے کچھ مونہہ سے تو پھوٹ کر بس۔" بڑی منتوں سماجتوں کے بعد کہا کہ سلیم میاں ایک کرسٹانی سے بیاہ کر رہے ہیں۔"

"اے تو کیا ہوا کرسٹان تو اہلِ کتاب ہوتے ہیں اُن میں شادی جائز ہے۔"

چچا میاں پر اوس پڑ گئی مگر فوراً بات پلٹ دی۔

"مگر وہ تو شادی شدہ ہے!" چچا میاں نے اڑائی۔

"ہے ہے!" نانی اماں نے چھاتی کوٹ لی۔

"اُس کا میاں سلیم کی گردن کاٹنے کو پھر رہا ہے۔"

اب تو نانی اماں واقعی چونک پڑیں۔

"ہے کون وہ کلموہی؟"

"کلموہی نہیں پھپھو گوری بھک ہے۔"

"کسی گورے کی بیوی ہے؟"

"ہاں کپتان ہے، غصہ تو اس کی ناک پر دھرا رہتا ہے۔ جب سے سُنا ہے بس پستول تانے گھوم رہا ہے۔"

نانی اماں نے جلدی سے ایک کٹورا ٹھنڈا پانی پیا۔ اور پسینے چھوٹنے لگے۔ "اے پروردگار، یا مولیٰ مشکل کشا اب کیا ہوگا؟" بڑی غور و خوض کے بعد چچا میاں نے گھما پھرا کر رائے دی کہ سلیم میاں کی جان بچانا چاہتی ہو تو اُسے یہاں سے چلتا کرو۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔

نانی اماں نے بہت سمجھایا مگر چچا جان نے سلیم میاں کو پہلے سے پٹی پڑھا دی تھی۔ وہ ولایت جانے پر کسی طرح راضی ہی نہ ہوتے تھے

بڑی مشکل سے نانی اماں نے اپنی جان کی قسم دی، پورے خاندان کو گھسیٹ ڈالا اور سلیم میاں کو ولایت بھیج کر ہی دم لیا۔

یہ میں بہت برس کی بات کہہ رہی ہوں۔ اب تو نانی اماں کے دالان میں ہر طرف چمڑے کی کترنیں بکھری رہتی ہیں اور دھڑا دھڑ رانپی اور ہتھوڑی کی آوازیں گونجا کرتی ہیں۔ مرغیوں نے سب کیاریاں کھود ڈالی ہیں۔ اور نانی اماں کے مٹھن کُتّے کے مرنے کے بعد سے گلی کے کتّوں نے گھر کو کتّا کلب بنا ڈالا ہے۔ نوکر چاکر سب اسی وقت تتر بتر ہو گئے تھے جب ایک دن نانی اماں ہتراتی پر ڈانٹ پھٹکار کرتے کرتے ایک دم اُونگھ گئیں۔

اور پھر خراٹوں سے گھر کی بنیادیں نہیں لرزیں تب سب نے ڈرتے ڈرتے انہیں مغرب کی نماز کے لئے اٹھانا چاہا تو وہ ہمیشہ کے لئے سو چکی تھیں۔

اور نانی اماں کا بڑا سا لوہے کا سیف کھولا گیا تو اس میں سے ایک عدد ٹوٹا ہوا چاندی کا لچھا اور مکان بیچے جانے کے کاغذات نکلے۔ نانی اماں تو کوڑی کوڑی کو محتاج تھیں جن بیٹوں بیٹیوں کو وہ جائیداد سے محروم کرنے کی دھمکیاں دیتی تھیں وہ حساب میں اُلٹ پھیر کر کے انہیں دولت مند بنائے ہوئے تھے۔ سلیم میاں کو تو سرکار سے وظیفہ ملا تھا۔ مگر سب نے یہ جتایا کہ وہ خرچ برداشت کر رہی ہیں۔ نانا میاں انہیں کنگال چھوڑ گئے تھے مگر اُن کے بچّوں نے یہ بات کبھی اُن پر ظاہر نہ ہونے دی۔

جب تک نانی اماں جیتی رہیں یہی سمجھتی رہیں وہی ہمارے گھر کی پالن ہار ہیں۔ اِسی لئے تو اُن کی آواز میں طوفان کی سی کڑک تھی۔

واقعی وہ رئیسِ اعظم تھیں ـــ اُن کی دولت اُن کی پیار کرنے والی اولاد تھی۔ ●●

اوپر
ایک تصویر
شائع کی جارہی ہے،
مگر یہ کیا ___؟
اس میں بات چیت تو دکھائی
نہیں گئی، ہاں بھئی یہ تصویری
کارٹون ہے، اس میں بات چیت
تمہیں بھرنی ہوگی اور اس پر انعام ملے گا۔
اپنا جواب ایک پوسٹ کارڈ پر نیچے لکھے ہوئے پتے پر
بھیج دو۔ جو جواب سب سے دل چسپ اور مزاحیہ ہوگا اس کے
بھیجنے والے کو دس دل چسپ کتابیں انعام دی جائیں گی۔
تصویری کارٹون نمبر ۷۹، ماہ نامہ کھلونا، آصف علی روڈ، نئی دہلی

ہمیں جواب ملنے کی آخری تاریخ: ۱۵۔ فروری ۱۹۷۳

سلام مچھلی شہری

آؤ چلیں ماں!

آؤ چلیں ماں! ٹھنڈی فضاؤں میں
شہروں سے دُور کہیں چھوٹے سے گاؤں میں

مانا یہ چاندی کی دُنیا حسین ہے
دھرتی کی حُوروں کا جلوہ حسین ہے
اونچے اونچے محلوں کا نغمہ حسین ہے

کیسے یہاں گھُوموں کہ زور نہیں پاؤں میں
آؤ چلیں ماں! ٹھنڈی فضاؤں میں
شہروں سے دُور کہیں چھوٹے سے گاؤں میں

چارطرف اپنی ترقّی کا زور ہے
ناچ رہا جیسے کہ جنگل میں مور ہے
بڑی بڑی زندہ مشینوں کا شور ہے

سانس گھُٹی جائے یہاں کی ہواؤں میں
آؤ چلیں ماں! ٹھنڈی فضاؤں میں
شہروں سے دُور کہیں چھوٹے سے گاؤں میں

سڑکوں پہ، گلیوں میں فلمی ترانہ
یاد نہیں لیکن خوشی کا فسانہ
ان کو مبارک مہذّب زمانہ

کون رہے سُندر منوہر بلاؤں میں
آؤ چلیں ماں! ٹھنڈی فضاؤں میں
شہروں سے دُور کہیں چھوٹے سے گاؤں میں

انسان جیسے ہوں باسی مزار کے
پھر بھی نہیں ہم کو دیہاتی پکار کے
ٹوٹ گئے تار یہاں من کے ستار کے

جنت ہماری وہیں پیپل کی چھاؤں میں
آؤ چلیں ماں! ٹھنڈی فضاؤں میں
شہروں سے دُور کہیں چھوٹے سے گاؤں میں

"اباجی" آئے ہیں روٹی کمانے
بیت رہی کیا اُن پہ اللہ جانے
اپنے ملیں اِس طرح جیسے بیگانے

جان نہیں کوئی بھی نقلی اداؤں میں
آؤ چلیں ماں! ٹھنڈی فضاؤں میں
شہروں سے دُور کہیں چھوٹے سے گاواں میں

زمانہ جس تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے کشیدہ کاری کے ڈیزائن بھی زمانہ کے ساتھ ہی چلنے چاہئیں ورنہ کپڑا آپ کا نیا ہوگا اور ڈیزائن پرانے۔ نئے فیشن کی ضرورتوں کے عین مطابق ہی بانو کشیدہ کاری ترتیب دی گئی ہے جو آج تک پیش کی جانے والی کشیدہ کاری کی کتابوں میں سب سے ممتاز مقام حاصل کر رہی ہے۔ اس کتاب میں موڈرن ڈیزائن لاجواب بیلیں، قمیض کے گلے، ساڑیوں اور دوپٹوں کے نئے دلکش ڈیزائن تکیہ کے اشعار کے ساتھ ساتھ بچوں کے کپڑوں کے بھی ڈیزائن دئے گئے ہیں —— تمام کی تمام فوٹو آفسیٹ کے حسین طریقے سے شائع کی گئی ہے۔ ایسی مکمل اور جامع کتاب ہے جس کی مدد سے نو آموز بہنیں بھی پوری طرح فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔

اردو، ہندی میں ——

قیمت : آٹھ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

شمع بک ڈپو ، آصف علی روڈ ، نئی دہلی

ٹارزن

بلونت سنگھ

ٹارزن میرے کُتّے کا نام تھا۔

یہ کوئی جھوٹی بات نہیں ہے۔ وہ سچ مچ میرا کُتّا تھا، اور میں واقعی اُس کا مالک تھا۔ آج بیس برس گزر جانے پر بھی مجھے وہ صبح یاد ہے جب مسوری کی ایک چکّردار پہاڑی سڑک پر میں دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ میرے برابر میں دو مہینے کا پلّا چل رہا تھا۔ یعنی یہی ٹارزن۔

اُن دنوں میں ابھی طالب علم ہی تھا۔ ہندوستان کے دو حصّوں میں بٹ جانے کے بعد چاروں طرف لڑائی اور لُوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ میں مسوری میں اپنے ایک ہم عمر دوست کے ساتھ رہتا تھا۔ وہیں مجھے ایک دن پتہ چلا کہ ایک صاحب کُتّے بیچنے کا کام کرتے ہیں۔ مجھے السیشین کُتّوں سے دلچسپی تھی اور اُن کا "کُتّا گھر" صرف اسی نسل کے لئے وقف تھا۔

چند دن اس سلسلے میں اُن سے بات چیت کرنے میں گزر گئے۔ اُن کا نام شاید زیڈ۔اے۔خان تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ میدانی علاقے میں سرکاری ملازمت کرتے تھے اور یہ کُتّوں کا بیوپار فالتو وقت میں کیا کرتے تھے۔ وہ بے حد ملنسار اور چرب زبان شخص تھے۔ کُتّوں کے بارے میں

اُن کی معلومات کا ذخیرہ بہت وسیع تھا۔ اس موضوع پر باتیں کرتے تو سننے والوں کو ایسا لگتا جیسے مشاعرے میں بیٹھے کسی نامور اُستاد کا کلام سُن رہے ہوں۔

بات چیت مسٹر خان کی چھوٹی سی بیٹھک میں چلا کرتی تھی۔ ان کے بنگلے میں کُتے ہنگامہ مچاتے رہتے تھے۔ عمر، رنگ رُوپ کے لحاظ سے وہ مختلف ہوتے تھے لیکن نسل ایک ہی ہوتی تھی ـــــ یعنی السیشین۔

اُس زمانے میں مسوری کا ہل اسٹیشن راجاؤں مہاراجاؤں اور رئیسوں کی توجّہ کا مرکز بنا رہتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کُتے بھی لاتے تھے بلکہ کُتے صاحب لوگوں سے پہلے آجاتے تھے کیونکہ انہیں میدانوں کی گرمی راس نہیں آتی تھی۔ یوں تو کئی نسلوں کے کُتے مسوری کی سڑکوں پر دکھائی دیتے تھے لیکن ان میں زیادہ تر میری پسندیدہ نسل کے ہی ہوتے تھے۔ اُن کے رنگ بھورے یا گہرے سُرمئی یا دونوں ملے جُلے ہوتے تھے۔ لیکن مسٹر خان کے یہاں مجھے ایسے السیشین دکھائی دیئے جو سر سے پاؤں تک اور تھوتھنی سے دُم کی نوک تک یا تو برف کی طرح سفید ہوتے تھے یا بالکل سیاہ۔ یہ رنگ شوقینوں میں مقبول نہیں تھے۔ البتہ خان صاحب نے بتایا کہ سفید رنگ کے کُتے بے حد غصیلے ہوتے ہیں۔

ایک دن چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے خان صاحب نے ٹارزن کے باپ سے میری جان پہچان کرانے کے لئے اُونچی آواز میں اُسے پکارا "پرنس! پرنس!"

اُن کی آواز کی گُونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک بھرپور جسم والا جوان سال اور جواں مرد کُتا کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کو دیکھ کر ایک بار تو میرا دل دہل سا گیا۔ دیکھنے میں وہ زیادہ ڈراؤنا کتا نہیں تھا لیکن یہ ضرور لگتا تھا کہ ایک بار وہ کسی کا ٹینٹوا اپنے مضبوط جبڑوں میں تھام لے تو اُسے جہنم کے دروازے تک پہنچائے بغیر نہیں چھوڑے گا۔

خان صاحب نے فوراً پرنس کے گُن گانے شروع کر دیئے۔ کُتا ہر لحاظ سے مجھے اتنا پسند آیا کہ اُس کے بارے میں خان صاحب کی ہر بات کو صحیح ماننا ہی پڑا۔ اُنہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ فلاں ریاست کی مہارانی صاحبہ نے پرنس کے لئے سات ہزار روپے کی آفر کی تھی لیکن انہوں نے انکار کر دیا ہے۔

اس طرح مجھے گرمانے اور برمانے کے بعد خان صاحب نے پرنس کے بیٹے "ٹارزن" کو میرے حوالے کر دیا، اور میرے شوق اور مالی حالت کے پیشِ نظر انہوں نے صرف تین سو روپے وصول کئے۔

مجھے ٹارزن نام پہلے ہی سے پسند تھا۔ بچپن میں ایک فلم دیکھی تھی جو ایک ایسے جنگلی ہیرو کے کارناموں سے لبریز تھی جسے افریقہ کے جنگلوں میں بندروں نے پالا تھا۔ اس سیریز کی پہلی فلم کا نام شاید "ٹارزن دی ایپ مین" TARZAN, THE APE MAN تھا۔ اس فلم میں ٹارزن کا رول ادا کرنے والے ایکٹر کا نام جونی وِیسمُلر تھا۔ وہ قدآور، جوان، طاقتور اور تیراکی کا چیمپئن تھا۔ اس نام نے جب ہی سے میرے دل پر جادو چلا رکھا تھا۔ شاید خان صاحب نے یہ سمجھ کر کہ یہ لڑکا اس نام کو پسند کرے گا جان بوجھ کر میرے کتے کا نام ٹارزن تجویز کیا تھا۔

چھوٹی سی عمر میں بھی ٹارزن خوب موٹا تازہ اور ٹھوس تھا۔ میں اسے بغل میں دبا کر رہائش گاہ کو روانہ ہوا۔ کبھی کبھی تھک کر مجھے بازو بھی بدلنا پڑتا تھا۔

مسوری والے گھر میں پہنچا تو میرا ساتھی ٹارزن کو دیکھ کر کچھ خوش نہیں ہوا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ٹارزن نے اس کا

من موہ لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس نسل کے کتے نہایت ذہین اور حساس ہوتے ہیں۔ میرے ایک دوست فوج میں میجر ہیں۔ انہیں بھی کتوں سے گہری دل چسپی ہے۔ انہوں نے اعلیٰ نسل کی ایک کُتیا پالی، ایک روز غلط طور پر کُتیا کو ڈانٹ دیا۔ بس جناب! کُتیا کا موڈ خراب ہو گیا۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ انتہائی کوشش کے باوجود اس جانور نے اشرف المخلوقات کو معاف نہیں کیا۔ آخر جب نئے مالک کے پاس پہنچی تو کُتیا کا موڈ ٹھکانے پر آیا اور اس نے باقاعدگی سے کھانا پینا شروع کر دیا۔

اِسی طرح نیوفاؤنڈلینڈ کے کُتے کی ذہانت کی مثال میرے سامنے ہے۔ لڑکپن میں میرے والدین دہرہ دون کے ایک انجینئر صاحب کے یہاں جایا کرتے تھے۔ شاید اُن سے ہماری دُور کی رشتہ داری بھی تھی۔ ہم جب جاتے تو وہاں دو چار دن تک ٹکے رہتے۔ ان کے یہاں جیک نامی کُتا تھا جو نیوفاؤنڈلینڈ کی نسل سے تھا۔ انجینئر صاحب کے باورچی کی ڈیوٹی تھی کہ دن میں دو بجے جیک کو 'بڑا کھانا' اسے کھلائے 'چھوٹا کھانا' یعنی ناشتہ انجینئر صاحب خود اپنے ساتھ اُسے کھلا کر دفتر کو جایا کرتے تھے۔ کسی روز جب کبھی باورچی کھانا دینا بھول جاتا تو جیک خفا ہو جاتا، لیکن خاموش رہتا۔ شام کو صاحب دفتر سے واپس آتے تو جیک اپنے بھوجن کا تام چینی کا خالی برتن دانتوں سے پکڑ کر صاحب کے سامنے جا کر رکھ دیتا۔ انجینئر صاحب مطلب سمجھ جاتے اور باورچی کو آواز دے کر کہتے "تم نے آج جیک کو کھانا نہیں کھلایا! دیکھو تمہاری شکایت کر رہا ہے"۔۔۔ جیسے جیک کو معلوم تھا کہ باورچی تو صرف نوکر ہے اور اگر وہ کوئی غلطی کرے تو اس کی شکایت بڑے صاحب سے ہی ہونا چاہیے۔
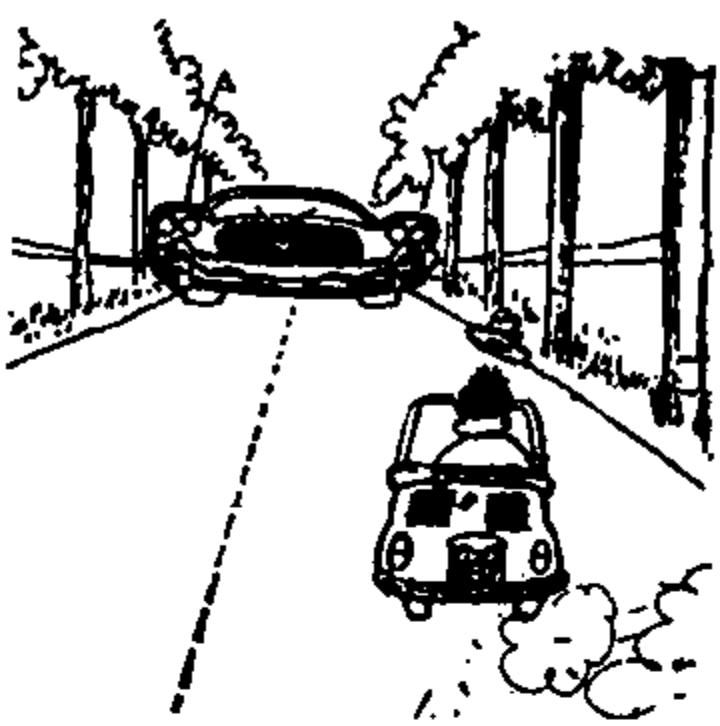
اب کدھر جائیں ؟

ٹارزن بلا کا ذہین تھا۔ کُتا غصے میں ہے یا خوش اس کا پتہ تو خیر چل ہی جاتا ہے۔ لیکن ٹارزن شرمندگی، تعجب، پچھتاوے اور ذہنی کشمکش کا اظہار بھی بخوبی کر سکتا تھا۔ چند دن میں میرے ساتھی کو بھی ٹارزن سے گہری دل چسپی پیدا ہو گئی۔ اور وہ ہم دونوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

ٹارزن کو سکھایا گیا تھا کہ وہ خود اپنا کھانا بھی بغیر اجازت کے نہ کھائے۔ یہ ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ ٹارزن کے سامنے اس کا کھانا رکھ دیا جاتا تو بھی وہ اس بات کا انتظار کرتا کہ اُس سے کھانا شروع کرنے کے لئے کہا جائے ورنہ وہ دَم سادھے بیٹھا رہتا۔ اُسے ہاتھ ملانا بھی سکھایا گیا۔ جس کسی سے کہا جاتا وہ اُس سے اپنا پنجہ ملا لیتا تھا۔ جب گھر کا کوئی آدمی کہتا، "ٹارزن! ہاتھ ملاؤ" تو وہ بڑی شان سے بڑھ کر آگے کو آتا اور اپنا پنجہ بڑھا دیتا۔

کھیل کھیل میں ہم ہر وقت اس سے ہاتھ ملانے پر تُلے رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ اس مشغلے سے بے زار بھی ہو جاتا۔ ایسی حالت میں اُسے ہاتھ ملانے کے لئے کہا جاتا تو وہ دُور کرنے میں

سے ہی پنجہ اُٹھا دیتا۔ اُس کی شکل سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہاتھ ملانے کو وہ سنجیدہ اور شریفانہ کام سمجھتا تھا۔ اور ہمارا اِس کام کو مذاق بنا کر رکھ دینا اُسے ہرگز گوارا نہیں تھا۔

السیشین نسل کے کُتوں کے کان ہمیشہ کھڑے رہتے ہیں۔

لیکن بچپن میں کان نیچے گرے رہتے ہیں۔

مجھے بڑا ارمان تھا کہ ٹارزن کے کان جلد کھڑے ہو جائیں۔ خان صاحب تسلیاں دیتے کہ بڑا ہونے پر اس کے کان خود کھڑے ہو جائیں گے۔ خدا خدا کر کے ٹارزن نے ایک کان کھڑا کیا۔ ہم نے بڑی خوشی منائی۔ اُس روز اُسے اور بھی بہتر کھانا دیا۔ ٹارزن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی اِتنی خاطر کیوں ہو رہی تھی اور ہم اس قدر خوش کیوں تھے۔

جب میں مسوری سے الٰہ آباد آیا تو اس وقت تک ٹارزن کے دونوں کان کھڑے ہو چکے تھے۔ مجھے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ملازمت کے سلسلہ میں دہلی جانا پڑا۔ میں نے ٹارزن کو والد صاحب کے حوالے کر دیا، کیوں کہ وہ بھی کتوں کے بڑے شوقین تھے۔ اب ٹارزن اُن ہی کا ہو کر رہ گیا۔

اُن دنوں شہر الٰہ آباد میں شاید ہی کسی کے پاس اس نسل کا کتا رہا ہوگا۔ چنانچہ جب میں ٹارزن کے پٹے سے زنجیر باندھ کر باہر نکلتا تو بازار میں لوگ کائی کی طرح پھٹ کر اِدھر اُدھر ہو جاتے۔ عام لوگوں کو تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کُتا ہے۔ کوئی اُسے سیار سمجھتا، کوئی لگڑ بگڑ کہتا تھا۔ ایک بزرگ خاتون نے پہلے تو اُسے ہرن بتایا اور پھر اُسے بکرا سمجھ بیٹھیں۔ عام طور پر اُسے سدھایا ہوا بھیڑیا سمجھا جاتا تھا۔

السیشین کافی بڑا کتا ہوتا ہے لیکن بہت بڑی نسل کا نہیں مانا جاتا۔ گریٹ ڈین (GREAT DANE) سنٹ برنارڈ (ST. BERNARD) مسٹیف (MASTIFF) اور نیو فاؤنڈ لینڈ بڑے بھاری بھرکم کتوں میں شمار ہوتے ہیں۔ کندھے سے زمین تک بڑے کتے چالیس انچ تک کے بھی ہوتے ہیں، لیکن اکثر کم اونچائی کے ہوتے ہیں۔ السیشین نر کی اونچائی پچیس انچ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ اس کُتے کی پچھلی ٹانگیں اس قدر لچک دار ہوتی ہیں کہ وہ ایک دم پیچھے کی طرف مڑ سکتا ہے۔ ایک بار ٹارزن میرے ساتھ جا رہا تھا، پیچھے سے ایک آدمی بچھڑے کو ڈنڈے سے ہانکتا ہوا آیا۔ جب وہ آدمی میرے برابر میں پہنچا تو اُس کے اوپر کو اُٹھے ہاتھ کی وجہ سے ٹارزن سمجھا کہ وہ مجھے ڈنڈا مارنے والا ہے چنانچہ ٹارزن پلک جھپکتے میں مڑ کر اُچھلا اور اس نے اُس شخص کی کلائی ہوا میں تھام لی۔ غنیمت یہ ہوا ٹارزن نے بس اس کے ہاتھ کو روک دیا، اُسے کاٹا نہیں۔

یہ کُتا کئی خوبیوں کا مالک ہوتا ہے۔ اسے بے حد شریف مزاج کا مانا جاتا ہے۔ وہ صرف اپنے مالک کا وفادار ہوتا ہے۔ کسی غیر سے کبھی مانوس نہیں ہوتا۔ صحیح ذات والے السیشین کی چال مخصوص انداز کی ہوتی ہے۔ اُس کی گپھے دار دُم کبھی کمر کی سطح سے اوپر نہیں اُٹھتی۔ ہاں کبھی کبھی انتہائی غصّے کی حالت میں ایسا ہو بھی جاتا ہے۔

دہلی میں ملازمت کے باعث ٹارزن کا اور میرا ساتھ قائم نہیں رہ سکا۔ والد مرحوم نے اس کی عادتوں کو بے حد بگاڑ دیا تھا۔ مگر اُن دونوں کا آپس میں بہت پیار تھا۔ ٹارزن سے پہلے والد صاحب نے وفات پائی۔ اُس رات اُن کی موت سے پہلے ٹارزن نے کئی بار تھوتھنی اوپر کو اُٹھا کر رونے کے انداز میں مہیب آواز نکالی ـــــ کیا اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ والد صاحب کی موت قریب آ چکی تھی؟

ٹارزن طبعی عمر پا کر مر گیا۔ اُس کی موت پر مجھے اتنا دُکھ ہوا کہ دِل سے کُتے پالنے کا شوق ہی جاتا رہا۔ ★★

واجدہ تبسم

آسمان کے رنگ

آج فرمان کی سال گرہ تھی۔

بڑے باپ کا بیٹا —— اور وہ بھی اکلوتا —— یہ موقع سال میں ایک بار ہی تو آتا تھا اُس دن آبا حضور بچوں سے بڑھ کر بچّہ بن جاتے —— آفس کو اس دن وہ گولی مار دیتے۔ صبح سے وہ شور مچاتے، بچّے اُن کے سامنے مات کھا جاتے۔ اُن کی لمبی سی تتلی جیسی کار مارکیٹ کے ہزاروں پھیرے کئے جاتی مگر اُن کی تسلی نہ ہوتی۔

باہر لان میں سویرے سے ہی لاؤڈ اسپیکر لگا دیا جاتا

انگلش میوزک سے لے کر، ہندوستانی موسیقی، فلمی گانے، قوالیاں کان پھاڑے ڈالتیں۔ اِدھر کوٹھی کے اندر بڑے والے ہال میں زور زور سے ریڈیو گرام پر ریکارڈ بج رہے ہوتے ـــــ اسی پر بس نہ تھا بلکہ دوست احباب کے بچّوں کے علاوہ پاس پڑوس کے سارے ہی بچّے صبح سے ہی بُلالئے جاتے، بے سُری آوازوں میں وہ دنیا بھر کے گیت گاتے۔ چیختے چلاتے، دھُومیں مچاتے اور ابا حضور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے جاتے۔

"چار لڑکیوں میں ایک ہی تو لڑکا اللہ نے دیا ہے اس کی سال گرہ پر بھی شور شرابہ نہ ہو تو پتہ کیسے چلے کہ اس کی سال گرہ کا جشن ہے۔"

جس کی سال گرہ ہو اُسے تحفے ملنا تو عام سی بات ہے ابا حضور کے چاؤ کا یہ عالم تھا کہ وہ سال گرہ پارٹی میں آنے والے ہر بچّے کو تحفوں سے لاد دیتے ـــــ کھلونوں کی ایک دکان سی کُھل جاتی۔ اپنی اپنی پسند کے کھلونے سمیٹے بچّے اس قدر شور مچاتے، ہنستے، چیختے چلاتے کہ کان پھٹ ہونے کی نوبت آجاتی۔

ثمّو کے لئے یہ سب کچھ بڑا عجیب، نیا اور غیر یقینی سا تھا۔ نو دس سال کی بھولی بھالی بِٹیا سی بچّی ـــــ بچپن میں ہی جب ماں اور باپ دونوں ہی چھوڑ کر چلے جائیں تو ویسے ہی دنیا بڑی اجنبی سی جگہ لگنے لگتی ہے اور پھر وہ تو گاؤں سے اٹھا کر ایک دم سے ایسے ماحول میں پہنچا دی گئی جو کہانیوں کے دیش سے بھی سوا تھا ـــــ ابھی چند روز پہلے چھٹیوں میں جب امّی بی بی گاؤں گئیں تو وہاں ثمّو پر نظر پڑ گئی ـــــ حویلی کے ایک کونے میں پکّے حوض کے نل کے نیچے بیٹھی اپنے چھوٹے چھوٹے کمزور ہاتھوں سے گھر بھر کے میلے کپڑوں کا ڈھیر دھو رہی تھی۔ بڑی بڑی چادریں، تولیں سے ٹھیک سے نچوڑی بھی نہ جا رہی تھیں امّی بی بی کمرے سے نکل کر بچھپاڑے گئیں تو وہ بڑی اپنائیت سے بولی:

"بی بی جی آپ کے بھی کوئی کپڑے دھونے ہوں تو دے دیجئے ـــــ"

امّی بی بی کو بے پناہ ترس آگیا ـــــ

"تمہاری ننھی سی جان دیکھو اور یہ کپڑوں کا انبار! اور ابھی دھونے کی ہوس باقی ہے؟"

وہ بڑے غم ناک انداز میں مسکرا کر بولی "کام نہیں کروں گی تو پیٹ کھانے کو کون پوچھے گا؟"

"کیوں تمہارے ماں باپ نہیں ہیں؟"

"اونہوں ـــــ" اُس نے دکھ سے کہا "جب بہت چھوٹی سی تھی تبھی مر گئے تھے ـــــ دونوں ہی"

امّی بی بی نے اور کچھ نہیں پوچھا ـــــ پوچھ کر فائدہ بھی کیا تھا ـــــ خدا کی دنیا میں کتنے لوگ غموں سے چُور پڑے ہیں ـــــ پوچھ کر اُسے دُکھ ہی تو دینا تھا ـــــ بس انہوں نے یہ کیا کہ واپسی میں اُسے اپنے ساتھ گھر لے آئیں۔

"بڑے سرکار دل والے تو تھے ہی ـــــ کتنے سارے نوکر اور ان نوکروں کے بچّے بھرے پڑے تھے، یہ ایک اور سہی، کم سے کم پڑھ لکھ تو لے گی۔"

شہر کی جگمگاہٹ۔ گاؤں کے مقابل ہزار گنا بہتر کھانوں اور بچیوں کے اُترن کپڑوں کی بے پناہ خوشیوں سے ابھی وہ سنبھل بھی نہیں پائی تھی کہ فرحان میاں کی سال گرہ کے جشن نے اُسے بوکھلا کر رکھ دیا۔

پورے گھر کو (جسے وہ اپنی گاؤں زدہ جاہلیت کی وجہ سے گھر کہتی تھی ـــــ جو تھی دراصل شان دار کوٹھی) بے پناہ پھولوں، غباروں اور چمک دار پنّی کے رنگین کاغذوں سے سجایا گیا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر چیخ رہا تھا ـــــ اندر ریکارڈ بج رہے تھے۔ بچّے خود بھی چیخ چلا رہے تھے اور غباروں کو ایک دوسرے سے

رگڑ کر بے پناہ شور پیدا کر رہے تھے ـــــ ابا حضور نے تحفوں میں بے حساب سیٹیاں بانٹی تھیں، کئی بچّے "چور سپاہی" کا کھیل کھیل کر تیز تیز سیٹیاں بجا رہے تھے۔ اُدھر کچن میں بے حساب پکوان پک رہے تھے اور برتنوں کا شور سارے شور کو دوگنا تگنا کئے دے رہا تھا ـــــ شور کا یہ عالم تھا کہ باہر سے کوئی نوکر کسی کام کے لئے دوسرے نوکر کو پکارتا تو اُسے چیخوں میں پکارنا پڑتا۔

شمّو ایک حیرت انگیز مسرت سے یہ ناقابلِ یقین تماشہ دیکھتی پوری کوٹھی میں گھوم رہی تھی۔ اس کے سرخ سرخ گال خوشی سے تمتما رہے تھے، کالی کالی معصوم آنکھیں ہیروں کی طرح دمک رہی تھیں ـــــ کبھی کبھار آپ ہی آپ وہ ہنس دیتی تو اس کے خوب صورت دانت موتیوں کی طرح چمک اُٹھتے۔ بے پناہ گھنے بال اُس کے کندھوں پر آگے پیچھے جھول رہے تھے اور وہاں کی سب سے چھوٹی بہن شیتی کی ایک اُترن فراک میں بلاشبہ وہ محفل کی سب سے حسین گڑیا سی نظر آ رہی تھی۔ پھر اُس کا ڈرا ہوا، سہا ہوا لیکن ماحول کی خوب صورتی سے حوصلہ پایا ہوا۔ تجسّس اُسے کشاں کشاں تحفوں کی عظیم الشان میز کے پاس لے گیا۔ جہاں ایسے ایسے تحفے سجے ہوئے تھے کہ زندگی میں کبھی اُس نے خوابوں میں بھی نہ دیکھے ہوں گے۔

لمبی سی میز کو ایک سرے سے دیکھتی ہوئی وہ جانے کتنی دیر میں دوسرے سرے تک پہنچی۔ کونے میں ایک چھوٹا سا پیانو رکھا ہوا تھا ـــــ اس نے آج تک پیانو نہیں دیکھا تھا، وہ بڑے غور سے اُسے جھک کر دیکھنے لگی ـــــ کچھ سمجھ میں نہ آیا یہ کیا شے ہو سکتی ہے ـــــ ایک بالشت چوڑا دو بالشت لمبا ـــــ یہ کیا ہو سکتا ہے ـــــ؟ اُس نے انگلی سے ذرا سا چھو کر دیکھا دھن سے ایک پیاری سی آواز نکلی ـــــ جو اتنے بڑے غل غپاڑے اور شور شرابے میں جانے کدھر دب کر رہ گئی ـــــ اس نے دوبارہ سے انگلی دبائی ـــــ پھر ایک بار اور ـــــ پھر ایک بار اور ـــــ

اتنے شور میں تو آواز اچھی طرح اُس کے کانوں تک پہنچ بھی نہیں پا رہی تھی۔ اُس نے اب کے ذرا زور لگا کر انگلی دبائی ـــــ ایک خوب صورت سُر پھر بے پناہ شور میں ڈوب گیا۔

اب کے سے اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے ایک ساتھ پیانو کو دبایا ـــــ اور ادھر چٹاخ سے ایک زوردار تھپڑ اس کے نرم نازک گال پر پڑا۔

"کُتیا کہیں کی ـــــ شرم نہیں آتی اتنا شور کرتے ہوئے؟"

اس نے گھبرا کر سر اُٹھایا ـــــ ابا حضور غصّہ میں سرخ ہو رہے تھے۔

اُدھر کئی بچّوں نے مل کر ایک کورس گانا شروع کر دیا تھا ـــــ

آسمان کے کتنے رنگ ہوتے ہیں ـــــ!
آسمان جو مہربان ہے ـــــ کبھی ہرا ہے۔ کبھی نیلا۔ کبھی گلابی ـــــ کبھی زردی۔
آسمان کے کتنے رنگ ہوتے ہیں۔
آسمان جو باغ ہے ـــــ کبھی پھولوں کی طرح گلابی ہے، ندیوں کی طرح نیلا ـــــ جو بہاروں میں بنفشی ہے تو برسات میں۔

شمّو نے اپنی سسکی کو روک کر گانے والے بچوں کی طرف دیکھا۔

"میری پوچھو تو کہوں ـــــ آسمان کا رنگ ہر جگہ ایک ہے۔

"گاؤں میں بھی شہر میں بھی"

لیکن وہ یہ بات اپنے ہونٹوں سے نہ نکال سکی غریبوں کا بات کرنا بھی تو شور مچانا ہی ہے نا!

■ ■

پاس ہوئے

حسرت جے پوری

جی جان سے ہم نے محنت کی ہم اوّل نمبر پاس ہوئے
اسکول سے ہم نے اُلفت کی ہم اوّل نمبر پاس ہوئے

پکچر بھی نہیں دیکھی ہم نے ہاکی بھی نہیں کھیلی ہم نے
لے لے کے کتابیں پڑھتے رہے اور خوب پڑھائی کی ہم نے
اُستاد کی ہم نے عزّت کی ہم اوّل نمبر پاس ہوئے
جی جان سے ہم نے محنت کی ہم اوّل نمبر پاس ہوئے

دن رات جو کھیلا کرتے تھے وہ بھائی ہمارے فیل ہوئے
دن رات جو گھوما کرتے تھے وہ بھائی ہمارے فیل ہوئے
اس کھیل سے ہم نے نفرت کی ہم اوّل نمبر پاس ہوئے
جی جان سے ہم نے محنت کی ہم اوّل نمبر پاس ہوئے

اب پیارے امّی کہتی ہیں اِک سوٹ تمہیں بنوا دیں گے
اب پیارے پاپا کہتے ہیں دِلّی سے کھلونا لا دیں گے
ماں باپ کی ہم نے خدمت کی ہم اوّل نمبر پاس ہوئے
جی جان سے ہم نے محنت کی ہم اوّل نمبر پاس ہوئے

ہر سال رہیں گے ہم اوّل اور آگے بڑھتے جائیں گے
اس دیش کے ننھے مُنّے ہیں ہم اپنے ہُنر دکھلائیں گے
کیا بات ہماری ہمّت کی ہم اوّل نمبر پاس ہوئے
جی جان سے ہم نے محنت کی ہم اوّل نمبر پاس ہوئے

ایک روز ہمارے پڑوس کا ایک بچہ منٹی جو بے حد موٹا اور گول مٹول ہے۔ میرے پاس یہ شکایت لے کر آیا: "انکل آپ نے میرے بارے میں ایک کہانی لکھ کر چھپوا دی ہے اور اب سب لڑکے مجھ پر ہنستے ہیں۔"

یہ سنتے ہی میرے کان کھڑے ہو گئے۔ مجھے اپنی کہانیوں سے ہمیشہ یہی ڈر لگا رہتا ہے کہ میری کہانیوں میں گھومنے پھرنے والے کردار کہیں اصلی نہ سمجھ لئے جائیں۔ کیوں کہ اکثر لوگ میری کہانیوں میں خود کو تلاش کر کے مجھے بتا چکے تھے۔ اس بات پر کچھ لوگوں کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ وہ کہانی کے آئینے میں اپنے چہرے دیکھ کر اُلٹا خوش ہوتے تھے، لیکن سب لوگوں کے بارے میں یہ بات کیسے کہی جا سکتی ہے۔ پسند اپنی اپنی۔ مزاج اپنا اپنا۔ بعض لوگوں کو تو اس بات پر بھی اعتراض ہے کہ میں سرے سے کہانیاں ہی کیوں لکھتا ہوں، جیسے ان کے خیال میں کہانی لکھنا یا نہ لکھنا اپنے بس کی بات ہے! کوئی اُن سے پوچھے کہ بھلے آدمی تم کھانا ہی کیوں کھاتے ہو، یا اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہی کیوں ہو تو وہ کیا جواب دیں گے؟ لیکن خیر، اس بے کار کی بحث کو چھوڑیئے۔ میں بھی ایسے لوگوں کے ساتھ کبھی نہیں اُلجھتا لیکن مجھے سب سے بڑی اُلجھن اس وقت ہوتی ہے جب کوئی شخص خواہ مخواہ یہ شکایت لے کر آ دھمکتا ہے کہ میں نے اپنی کسی کہانی میں ہو بہو اسی کا حلیہ کیوں بیان کر دیا ہے۔

اب سچی بات تو یہ ہے کہ اس دُنیا میں کئی ارب لوگ رہتے ہیں۔ اُن میں بھی کچھ لوگ ایسے ضرور ہوں گے جن کی شکل وصورت اتفاق سے ایک دوسرے سے مل جاتی ہوگی۔ اور پھر یہ تو بنانے والے کے ہاتھ میں ہے کہ وہ غلطی سے یا جان بوجھ کر کچھ لوگوں کو ایک سا ہی بنا دے۔ یعنی جب ساری دنیا کا خالق بھی ایسی حرکت کر سکتا ہے تو پھر میرے جیسے معمولی بے بس کہانی کار سے ایسی غلطی کیوں نہیں ہو سکتی کہ میں بھی کبھی کبھی ایسے شخص کا حلیہ پیش کر بیٹھوں جو سچ مچ اس کروڑوں مربع میل رقبہ پر پھیلی ہوئی دُنیا میں کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہو! لیکن اگر وہ شخص یہ ضد کرنے لگے کہ "تم نے کہانی میں ایک لنگڑے آدمی کا ذکر کیا ہے، اور چونکہ میں بھی لنگڑا ہوں لہٰذا وہ صرف میں ہی ہو سکتا ہوں!" تو بتایئے میں اُسے کیا جواب دوں؟

ہمارا پڑوسی بچہ منٹی بھی ٹھیک اسی طرح کی بات کہنے کے لئے میرے پاس آیا تھا کہ میں نے ایک کہانی میں ایک موٹے اور گول مٹول لڑکے کو پیش کر کے دراصل اس کو بدنام کرنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے منٹی سے پوچھا "کیا تم نے وہ کہانی خود

پڑھی ہے یا کسی اور سے سُنی ہے؟"

اُس نے فوراً جواب دیا "میں نے گولڈی سے سُنا ہے وہ کبھی جھُوٹ نہیں بول سکتا۔ اس نے مجھے کل فون پر بتایا کہ یہ کہانی آپ نے مجھ پر ہی لکھی ہے۔"

میں نے مُسکراتے ہوئے کہا "تم گولڈی کو فوراً بُلا کر لے آؤ تاکہ میں اس کی بھی سمجھ بُوجھ کا امتحان لے لوں۔ ہوسکتا ہے میری کہانی اس کی سمجھ میں آئی ہی نہ ہو۔"

منٹی نے تنک کر جواب دیا "ایسا نہیں ہوسکتا انکل "گولڈی کی سمجھ میں کہانی آئی ہی نہ ہو۔ وہ تو آٹھویں درجے میں پڑھتا ہے، یعنی مجھ سے بھی ایک درجہ آگے۔ وہ کہانیاں پڑھ پڑھ کر مجھے اکثر سُناتا ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں وہ ہر کہانی کو بہت اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔"

میں نے منٹی کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔" اچھا اچھا۔ تم ٹھیک کہتے ہوگے۔ لیکن ذرا جاؤ اب! گولڈی کو جلدی سے بُلا کر یہاں لے آؤ، میں خود ہی اس سے بات کروں گا۔"

منٹی تھوڑی ہی دیر میں گولڈی کو بُلا کر لے آیا۔ گولڈی اس وقت ہاکی ہاتھ میں لئے ہوئے تھا۔ شاید کھیل کے میدان کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا "کیوں گولڈی، تم نے کیا واقعی میری کسی کہانی میں منٹی کو ہُوبہُو دیکھا ہے؟"

گولڈی اپنی ہاکی سے ہوا میں ہی ایک خیالی گیند کے ہٹ مارتے ہوئے بولا "انکل میں نے منٹی سے یہ بات کہی ضرور تھی، لیکن سچ پوچھئے تو یہ بات مجھے راجُو نے بتائی تھی میں نے خود کہانی نہیں پڑھی تھی۔ آپ چاہیں تو راجُو سے

مونچھوں کا صحیح استعمال

پوچھ لیجئے، وہ برابر کی کالونی میں رہتا ہے، میں اُسے فون کر کے یہاں بُلائے لیتا ہوں۔“

ساجو کو فون کر کے بُلایا گیا۔ جب اُس سے اُس کہانی کے بارے میں پوچھا گیا جس میں منٹی جیسے گول مٹول لڑکے کا ذکر تھا تو اُس نے کہا ” وہ کہانی میں نے خود کب پڑھی ہے؟ مجھے تو ببیبی نے بتایا تھا کہ ”کھلونا“ میں ایک کہانی چھپی ہے۔ جو بالکل منٹی کے بارے میں ہے بس یہی بات میں نے گولڈی سے بھی کہہ دی تھی۔ آپ چاہیں تو ببیبی کو بُلا کر پوچھ سکتے ہیں۔ اس کا فون نمبر ایک دو تین چار پانچ چھ ہے۔“

ببیبی کو بھی ایک دو تین چار پانچ چھ نمبر پر فون کر کے بُلایا گیا۔ اس نے آتے ہی میرے ارد گرد کھڑے بچّوں کو بڑے غور سے دیکھا تو جیسے ساری بات سمجھ گیا اور اپنے آپ ہی کہہ اُٹھا ” انکل، اگر یہ سب لوگ آپ سے اس کہانی کے بارے میں بات کرنے آئے ہیں جو شاید آپ نے منٹی پر لکھی ہے تو میں آپ کو سچ سچ بتا دوں کہ میں نے ابھی اُسے پڑھا ہی نہیں ہے۔ مجھے وہ رسالہ مِل نہیں سکا۔ مجھے تو اصل میں کوچی نے بتایا تھا۔ کوچی ہمارے پڑوس میں رہتی ہے۔ ابھی میں یہاں آ رہا تھا تو وہ گلی میں سائیکل چلانے کی پریکٹس کر رہی تھی۔ مجھے معلوم ہوتا تو اسے ساتھ ہی لے کر آ جاتا —— اسے اب جا کر بُلا لاؤں انکل؟ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولے گی۔ بہت اچھی لڑکی ہے —— سچ بولنے پر ہی اُسے اسکول سے ایک بار انعام بھی مِلا تھا۔“

میرے 'ہاں' کہنے پر ببیبی بھاگ کر کوچی کو بُلا لایا۔

کوچی نے آتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے نمستے کہی اور بڑی صاف آواز میں کہا ” انکل جس کہانی کے بارے میں یہاں ہنگامہ ہو رہا ہے وہ کہانی میں ابھی تک نہیں پڑھ سکی ہوں کیوں مجھے وہ رسالہ تلاش کرنے پر بھی نہیں مِلا۔ میں نے ہر ایک بک اسٹال سے پوچھ لیا ہے۔ اس کہانی کے بارے میں مجھے سجو نے بتایا تھا۔ سجو اس وقت پارک میں کرکٹ کھیل رہا ہے۔ آپ چاہیں تو اُسے بلوا کر پوچھ لیجئے۔“

اب سجو کو بھی بلوایا گیا۔ وہ ایک ہاتھ میں اپنا کرکٹ کا بیٹ لہراتا ہوا اور دوسرے ہاتھ سے سر پر نائیٹ کیپ درست کرتا ہوا آیا اور بولا ” میں سمجھ گیا کہ آپ سب لوگ یہاں کیوں جمع ہیں، اسی لئے میں اپنے ساتھ اُن لڑکوں کو بھی لے آیا ہوں جو منٹی کے بارے میں لکھی ہوئی کہانی کے بارے میں جانتے ہیں۔ ان سے آپ خود پوچھ لیجئے۔“

پھر اُس نے خود ہی ایک لڑکے کو پُکار کر کہا ”گڈو، تم ہی نے تو مجھے بتایا تھا کہ ہمارے انکل نے ایک کہانی منٹی کے بارے میں لکھی ہے۔ کہا تھا نا؟“

گڈو نے اپنے ہاتھ میں اٹھائی ہوئی گیند ہوا میں بہت اونچائی پر پھینک کر اُسے جھپٹتے ہوئے جواب دیا ” ضرور کہا تھا' میں انکار کب کرتا ہوں۔ لیکن جب میں نے اس کہانی کا ذکر

دمتو سے کیا تو وہ بولا کہ "یہ کہانی منٹی کے بارے میں ہرگز نہیں ہو سکتی۔ وہ تو میرے ہی بارے میں ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ کہانی میں جس لڑکے کو اتنا زیادہ موٹا اور بھنسوڑ بتایا گیا ہے وہ تو میں ہی کر سکتا ہوں ــــ میں سچ مچ منٹی سے زیادہ موٹا بھی ہوں اور بھنسوڑ بھی۔ آپ چاہیں تو دمتو سے پوچھ لیجئے۔ وہ وہاں پیچھے کھڑا ہے، دروازے کے پاس"

سب نے سر گھما گھما کر دیکھا۔ دروازے کے پاس ایک بے حد موٹا لڑکا کھڑا تھا۔ ٹانگوں پر کرکٹ کے پیڈ باندھے ہاتھوں پر بھاری بھاری دستانے چڑھائے ہوئے اور سر پر کیپ بھی لگائے ہوئے وہ لڑکوں کی کرکٹ ٹیم کا وکٹ کیپر تھا۔ اس نے اپنا ذکر سُنا تو ہنستے ہوئے آگے آگیا۔ مجھے آداب کرکے بولا:

"انکل ــــ گڈو ٹھیک کہتا ہے۔ میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ وہ کہانی اصل میں میرے بارے میں ہے، منٹی کے بارے میں ہرگز نہیں۔ کیوں کہ جس لڑکے کو آپ نے اپنی کہانی میں پیش کیا ہے اس کی شکل صورت، ڈیل ڈول اور ساری حرکتیں مجھ سے ہی ملتی جلتی ہیں۔ لیکن میں اس کہانی کو پڑھ کر بہت ہی خوش ہوا ہوں۔ اگر آپ نے میرا اصلی نام یعنی دمتو بھی لکھ دیا ہوتا تو میں اور زیادہ خوش ہوا ہوتا۔ میں منٹی کی طرح شکائتی ٹٹو نہیں ہوں کہ ذرا ذرا سی بات پر مونہہ پھُلا لوں۔ انکل آپ آئندہ مجھ پر جتنی کہانیاں چاہیں لکھ سکتے ہیں۔ اگر چاہیں تو میں اپنے بارے میں آپ کو بہت سے دل چسپ لطیفے بھی بتا دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ منٹی کی طرف بڑے فخر سے دیکھنے لگا۔

دوسرے لڑکے بھی زور سے ہنس پڑے۔ کچھ لڑکوں نے تو منٹی کا مونہہ بھی چڑا دیا۔ اس کے بعد وہ اس طرح ہنستے ہوئے اور منٹی کو دھکیلتے ہوئے باہر چلے گئے۔ ■■

بتاؤ تو بھلا نمبر ا

آرٹسٹ نے یہ ایک عجیب تصویر بنائی ہے۔ دراصل اس وقت آرٹسٹ کے پاس کاغذ ایک ہی تھا اور تصویر میں چیزیں بہت ساری بنانی تھیں۔ کیا تم بتا سکتے ہو یہ کیا کیا چیزیں ہیں؟ اپنا جواب ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ کر (رسال نامہ میں شائع ہونے والے تمام مقابلوں جواب جواب علیحدہ علیحدہ کاغذ پر ایک ہی لفافے میں بھی بھیجے جا سکتے ہیں) "بتاؤ تو بھلا نمبر ا، ماہ نامہ کھلونا آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۱ کے پتے پر بھیج دو۔ ۲۲ فروری ۱۹۷۳ تک صحیح جواب بھیجنے والوں میں سے دس بہن بھائیوں کو دو دو روپے نقد انعام دیے جائیں گے۔

بتاؤ تو بھلا نمبر ا، ماہ نامہ کھلونا، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۱

مشورہ

کنہیا لال کپور

روشن کو صرف دو باتیں پسند تھیں: ہر شخص کا مذاق اڑانا اور گلیوں میں آوارہ پھرنا۔

روشن کا دل پڑھنے لکھنے میں بالکل نہیں لگتا تھا۔ کلاس میں جب کبھی اس سے کوئی سوال پوچھا جاتا وہ ہمیشہ اوٹ پٹانگ جواب دیتا۔ ایک دفعہ ماسٹر صاحب نے اس سے کہا: "اکبر اور اورنگ زیب کا مقابلہ کرو۔" اس نے گھبرا کر جواب دیا: "توبہ! توبہ! کہاں اکبر اور اورنگ زیب جیسے شہنشاہ اور کہاں میں۔ بھلا میں اکیلا ان دونوں کا کیا مقابلہ کروں گا!"

سب لڑکے ہنسنے لگے۔ ماسٹر صاحب نے اسے سست و سست کہنے کے بعد دوسرا سوال کیا: "کوروکشیتر کے میدان میں کون سی جنگ ہوئی تھی؟" روشن نے فوراً کہا: "جناب! پچھلے دنوں وہاں طلبہ اور پولیس میں ایک جھڑپ ہوئی تھی۔ لیکن اسے جنگ تو نہیں کہا جا سکتا۔"

"اچھا یہ بتاؤ۔" ماسٹر صاحب کا

نزلے کے جراثیم سے بچنے کا
بہترین طریقہ

تیسرا سوال تھا: "آگرہ کیوں مشہور ہے؟"
"اس لئے کہ وہاں ایک بہت بڑا پاگل خانہ ہے۔"

روشن کو اپنے اُستادوں کا خاکہ اُڑانے اور اپنے ہم جماعتوں کے نئے نئے نام رکھنے میں بہت لطف آتا تھا۔ اس کی کلاس میں ایک ہوشیار مگر غریب لڑکا تھا۔ جس کا گول مٹول چہرہ اور سر گھٹا ہوا تھا اس کا نام تو رشید تھا لیکن روشن اُسے "کدّو" کہہ کر پکارا کرتا۔ وہ اسے روز چھیڑتا۔

"ابے کدّو! ادھر آؤ تمہاری بھاجی پکا کر ہیڈ ماسٹر صاحب کو کھلاؤں گا۔" "ابے کدّو! سُنا ہے تمہارا باپ تمہیں سبزی منڈی میں بیچنے گیا تھا مگر تمہیں کسی نے نہ خریدا۔"

"ابے کدّو! تو اسکول میں کیسے آگیا؟ تجھے تو کھیت میں ہونا چاہئے تھا۔"

ایک اور لڑکا سلیم تھا۔ وہ ذرا لنگڑا کر چلتا تھا۔ کیوں کہ اس کے پاؤں میں نقص تھا۔ روشن اسے پرنس سلیم تیمور لنگ کہا کرتا تھا۔

جب کبھی حساب کے ماسٹر صاحب چھٹی پر ہوتے تو روشن لڑکوں سے کہتا "آج میں تمہیں حساب پڑھاؤں گا" وہ ماسٹر صاحب کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے کہتا:

"بچّو! میں نے تمہیں کل بتایا تھا کہ میرا باپ متھرا میں پنواڑی تھا۔ بچپن میں جب کبھی میں شرارت کرتا تو وہ مجھے پان کھلایا کرتا تھا پان کھا کھا کر میں ماسٹر بن گیا۔ لیکن مجھے آتا جاتا کچھ نہیں۔ جب میں خود طالب علم تھا تو مجھے حساب کے پرچے میں ایک بہت بڑا انڈا ملا کرتا۔ میں چونکہ کافی ڈھیٹ تھا۔ اس لئے اسے اُبال کر کھا جاتا یہی وجہ ہے میری صحت بہت اچھی ہے۔ میں جب تمہیں پیٹتا ہوں تو مجھے ذرہ بھر تھکن محسوس نہیں ہوتی تھکن کا تو سوال ہی کیا۔ مجھے ایک خاص قسم کی خوشی ہوتی ہے ــــ میں جانتا ہوں کہ تم میری عزت نہیں کرتے۔ لیکن اس کی مجھے کچھ پروا نہیں۔ میں اس قابل ہی کب ہوں جو میری عزت کی جائے۔ میرے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے صرف ایک دماغ نہیں۔ اگر تم کہیں سے مجھے ایک دماغ لا دو تو میں تمہارا احسان مانوں گا۔"

جب تاریخ کے ماسٹر غیر حاضر ہوتے تو روشن تاریخ کا سبق اس طرح پڑھاتا:

"بچّو! جہاں گیر اکبر کا بیٹا تھا۔ اکبر ہمایوں کا بیٹا تھا اور ہمایوں کس کا بیٹا تھا؟ اوہ! یہ تو میں بھول ہی گیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ کل یاد کر کے بتاؤں گا۔ اکبر کے نو رتن تھے۔ فیضی۔ ٹوڈرمل اور ــــ اور ــــ اور ــــ اُف۔ باقی سات کے نام ذہن سے اُتر گئے۔ اچھا پھر کبھی بتادوں گا۔ جہاں گیر نے نورجہاں سے شادی کی۔ نورجہاں کے پہلے خاوند کا نام تھا ــــ نام تھا ــــ خیر کچھ

ہوگا۔ اس وقت یاد نہیں آرہا۔ شاہ جہاں نے بہت سی خوب صورت اور تاریخی عمارتیں بنائیں ——— جیسے ——— جیسے ——— خیر آگے چلئے۔ جہاں گیر شعر بھی کہا کرتا تھا۔ اس کا ایک شعر مجھے بہت پسند ہے: وہ شعر ہے ——— شعر ہے ——— اُف پھر بھول گیا۔"

اسکول سے واپس آنے کے بعد روشن گلیوں اور بازاروں میں چکر لگایا کرتا، پتنگ اُڑاتا، جہاں کوئی کھیل تماشہ یا جھگڑا ہو رہا ہوتا، وہاں پہنچ جاتا۔ اکثر رات گئے گھر لوٹتا۔ جب اس سے پوچھا جاتا کہ وہ کہاں تھا تو جھٹ کوئی جھوٹا بہانہ گھڑ لیتا کہ فلاں ماسٹر صاحب کے گھر پڑھنے گیا تھا، فلاں دوست بیمار تھا، اس کا حال پوچھنے گیا تھا۔ جو کام اسے گھر پر کرنے کے لئے دیا جاتا کبھی نہ کرتا۔ جب وہ امتحان میں فیل ہو جاتا اور اس کے والدین ناراض ہوتے تو کہتا "اس میں میرا کیا قصور ہے۔ ماسٹر صاحبان جان بوجھ کر میرے نمبر کاٹ لیتے ہیں۔"

"کیوں؟" وہ پوچھتے۔

"اس لئے کہ میں کبھی کبھی ان کا خاکہ اُڑاتا ہوں۔" روشن جواب دیتا۔

ماں باپ پوچھتے "تم ایسا کرتے ہی کیوں ہو؟"

وہ سادگی سے کہتا "بس عادت سی ہوگئی ہے۔"

اس پر اسے "نالائق" کا خطاب ملتا اور بات آئی گئی ہو ہو جاتی۔

جب روشن دسویں جماعت میں چوتھی بار فیل ہوا تو ماسٹر صاحبان کے علاوہ اس کے ماں باپ بھی اس سے مایوس ہوگئے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ روشن کو کس طرح پڑھنے لکھنے پر آمادہ کیا جائے۔

ان ہی دنوں ایک نئے ماسٹر صاحب اسکول میں کہیں سے تبدیل ہو کر آئے۔ ان کا مشغلہ لڑکوں کے فطری رگاؤ کا مطالعہ کے متعلق مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا "میں روشن کی عادتوں اور حرکتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد کچھ بتا سکوں گا۔"

اس دن سے وہ یہ پتہ چلانے کی کوشش کرنے لگے کہ روشن کون سے میدان میں اپنے جوہر دکھا سکتا ہے۔ ایک ماہ کے بعد انہوں نے روشن کے والد کو بلوا بھیجا اور یہ مشورہ دیا "آپ کا لڑکا پڑھنے لکھنے میں دلچسپی نہیں لے سکتا، کیونکہ اُسے تعلیم سے سخت نفرت ہے۔ میری مانئے تو اسے کسی سرکس میں مسخرے کے طور پر بھرتی کرا دیجئے۔ وہاں یہ ایسے ایسے کرتب دکھائے گا کہ لوگ ہنستے ہنستے بے دم ہو جائیں گے۔"

روشن کے والد کو یہ تجویز بالکل پسند نہ آئی لیکن جب ماسٹر صاحب نے بار بار اس پر زور دیا اور روشن سے بھی صلاح کرنے کے لئے کہا تو انہوں نے اس پر غور کرنے کا وعدہ کرلیا۔

جب روشن سے پوچھا گیا کہ کیا وہ سرکس میں جانا پسند کرے گا تو وہ فوراً رضامند ہوگیا۔ کہنے لگا "میں خود کئی دن سے یہی بات آپ سے کہنا چاہتا تھا۔ لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔"

روشن ایک سرکس میں بھرتی ہوگیا۔ وہاں وہ مسخرے کا پارٹ اس کامیابی کے ساتھ ادا کرتا لوگ عش عش کر اٹھتے سرکس کے مالک نے خوش ہوکر اس کی تنخواہ دوگنی کردی۔ ——— ایک بار جب سرکس دوسرے ملکوں میں گیا تو روشن نے باہر کی دنیا کی بھی سیر کرلی۔ چند برس کے بعد روشن کی تنخواہ ایک ہزار ہوگئی۔ اب وہ جب بھی اپنے ماں باپ سے ملنے کے لئے آتا ہے، اسکول میں جا کر ان ماسٹر صاحب کے پاؤں چھو کر کہتا ہے: "آپ نے تو میری زندگی بنا دی۔ خدا کی قسم اگر آپ میرے والد کو مجھے سرکس میں بھجوانے کا مشورہ نہ دیتے تو آج میں دسویں جماعت میں اٹھارویں دفعہ فیل ہوگیا ہوتا۔" ■■

حمد کا ترانہ

محمد شفیع الدین نیر

جب روز سویرا ہوتا ہے
جب دور اندھیرا ہوتا ہے
جب دنیا کے اس گلشن میں
پھر نور کا پھیرا ہوتا ہے
ایک ایک کلی کھل جاتی ہے، اور اک اک چڑیا گاتی ہے
اس ایسے سہانے منظر میں، اللہ تری یاد آتی ہے
اللہ تری یاد آتی ہے

یہ دنیا رنگ بدلتی ہے
پھر ایک نئی کل چلتی ہے
"یہ دنیا ہے میدانِ عمل"
اس کل سے تان نکلتی ہے
ہر زندہ ہستی اس کی صدا پر، کاموں میں لگ جاتی ہے
اس ایسے سہانے منظر میں، اللہ تری یاد آتی ہے
اللہ تری یاد آتی ہے

کھیتوں پر دہقاں جاتے ہیں
کھیتی میں جان کھپاتے ہیں
دن بھر کی سختی سہہ سہہ کر
آرام کی راحت پاتے ہیں
جب آس ہری کھیتی کی، ان کو محنت پر اکساتی ہے
اس ایسے سہانے منظر میں، اللہ تری یاد آتی ہے
اللہ تری یاد آتی ہے

ہم نیک ارادے کرتے ہیں
سُستی بیکاری سے ڈرتے ہیں
ہر روز سدا آگے ہی بڑھیں
ایسے جینے پر مرتے ہیں
جب نیکی نُور کا پرتَو بن کر، چہروں کو چمکاتی ہے
اِس ایسے سُہانے منظر میں، اللہ تِری یاد آتی ہے
اللہ تِری یاد آتی ہے

جب ہم سب پڑھنے آتے ہیں
آپس میں گھُل مِل جاتے ہیں
جب سب کے سب خوش ہو ہو کر
نیر کا نغمہ گاتے ہیں
جب آپس کی یہ جوت، سبھی کے سینوں کو گرماتی ہے
اِس ایسے سُہانے منظر میں، اللہ تِری یاد آتی ہے
اللہ تِری یاد آتی ہے
اللہ تِری یاد آتی ہے
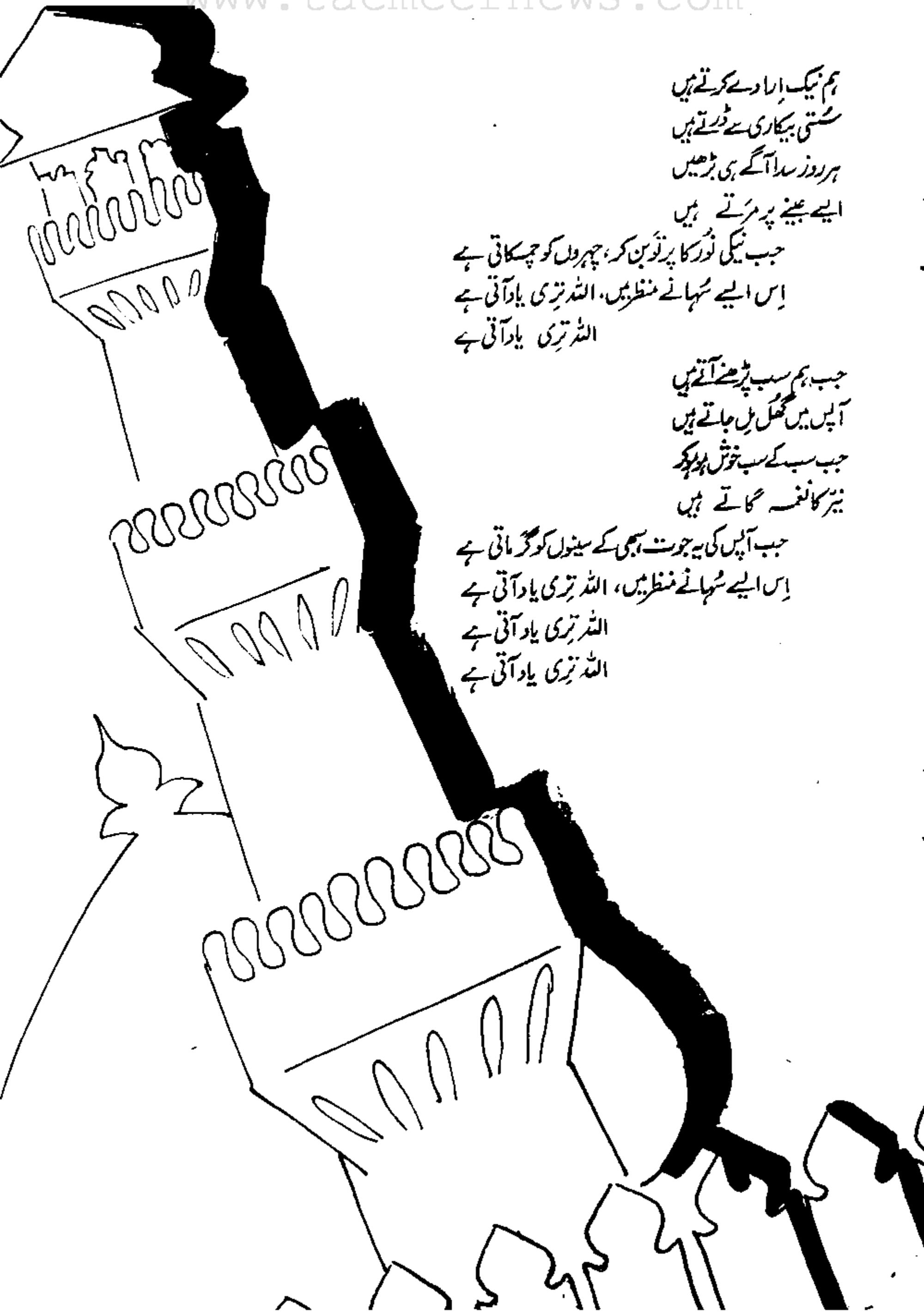
جیومیٹری کو آسان اور
جغرافیہ کو خوش رنگ بنائیے۔

فیثا غورث پر سبقت لیجا یئے نقشہ کشی میں رنگوں کا اضافہ کیجئے ۔۔۔ ایک کیملین انسٹرومنٹ بکس اور کلر پنسلیں خرید لیجئے۔ ایک استعمال میں بالکل صحیح ثابت ہوگا۔ اور دیکھنے میں خوشنما بھی ہے اور دوسرے کو آپ نرم اور رواں پائیں گے۔ دونوں بہت دنوں چلتے ہیں۔ اور ٹوٹ پھوٹ کر خراب نہیں ہوتے۔ کفایتی بھی ہیں۔
کیملین کے یہاں آپ آرٹ مٹیریلس کا ایک وسیع سلسلہ بھی پائیں گے۔ ویکس کریئنس، واٹر کلر، پوسٹر کلر، سب ہی چیزیں۔ انھیں اپنے قریب ترین ڈیلر کے یہاں طلب کیجئے۔
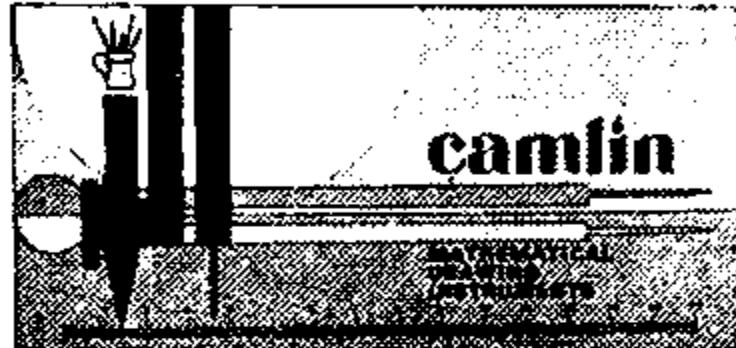
کلر پنسلیں اور
انسٹرومنٹ بکس خریدیئے

کیملین
پرائیویٹ لمیٹڈ
آرٹ مٹیریل ڈویژن
جے۔ بی۔ نگر۔ بمبئی ۔ ۵۹
(بھارت)

PRATIBHA 2013 25 URD

چراغوں کی بستی

ابرار محسن

جابر کا نام سُن کر ہی اچھے اچھے بہادروں کے کلیجے کانپ اُٹھتے۔ وہ قیامت تھا' قہر تھا۔ مائیں اس کا نام لے کر بچّوں کو ڈرایا کرتی تھیں۔ اُس کی بہت بڑی فوج تھی' جس کے سارے سپاہی خوں خوار درندے تھے۔ برق رفتار گھوڑوں پر سوار' ہاتھوں میں ننگی تلواریں سنبھالے وہ بھیڑیئے آندھی اور طوفان کی طرح اُٹھتے جس طرح ندی میں سیلاب آنے سے راستے میں آنے والی ہر چیز برباد ہوجاتی ہے' بالکل اسی طرح جابر اور اُس کی فوج راہ میں آنے والے ہر شہر' ہر قصبے اور ہر گاؤں کو روندتی ہوئی بڑھتی رہتی۔

جابر بہت لمبا تڑنگا، بھیانک شکل والا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ پہلے وہ معمولی لٹیرا تھا، مگر رفتہ رفتہ اُس کے گروہ میں اتنے لوگ جمع ہوگئے کہ اچھی خاصی فوج بنا کر وہ بے تاج بادشاہ بن بیٹھا۔ خود اُس کے آدمی اُس سے کانپتے تھے اور اُس کا ہر حکم بجالانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ وہ ذرا ذرا سی خطا پر اُنھیں موت کے گھاٹ اُتار دیا کرتا تھا۔

جابر کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔

شاہی فوجیں اُس کا نام سُن کر

میں کیا کروں دروازہ ہی چھوٹا ہے

بہت پہلے دُم دبا کر بھاگ جاتی تھیں رہے بستیوں کے لوگ
تو بھلا انھیں لڑائی بھڑائی سے کیا واسطہ! اور پھر جابر کا
مقابلہ کون کر سکتا تھا؟

بستیاں یوں ہی ویران ہوتی رہیں، کھیت اُجڑتے رہے،
لوگ قتل ہوتے رہے۔ اور جابر قہقہے لگاتا رہا۔

کچھ دن بعد تو ایسا ہونے لگا کہ جابر کے آنے کی خبر
سُن کر لوگ اپنا مال اسباب سمیٹ کر بستیاں چھوڑ کر بھاگ جاتے
جب جابر اور اُس کی فوج وہاں پہنچتے تو صرف اُجڑے ہوئے
مکان، ویران سڑکیں اور سناٹے ہی ملتے۔ جابر جھنجھلا جاتا اور
بڑی بے دردی سے مکانوں کو آگ لگوا دیتا۔

ایک روز جابر موت کے طوفان لئے چلا جا رہا تھا
اس کا چہرہ طیش کی وجہ سے لال ہو رہا تھا، ہونٹ بھینچے ہوئے
تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ ابھی تک جن بستیوں
سے ہم گزرے وہ ویران ہی
ملیں۔ ہم نے ابھی تک اپنا
کھیل نہیں کھیلا۔ ہماری تلوار پیاسی ہے۔"

"ہو سکتا ہے آگے کوئی بستی مل جائے۔" ایک آدمی نے
دھیرے سے کہا۔ "حضور مایوس نہ ہوں۔"

جابر کی تلوار فضا میں لہرائی اور دوسرے ہی لمحے اُس
آدمی کا سر زمین پر لڑھک رہا تھا۔

"جابر کبھی مایوس نہیں ہوتا۔" جابر دانت پیس کر کہہ
رہا تھا۔ "جو لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ مایوس بھی ہو سکتا ہے، اس کا
یہی حشر ہوتا ہے ـــــ اگر جابر مایوس ہوتا تو آج اتنا طاقت ور
نہ ہو جاتا۔"

اپنے ساتھی کا یہ انجام دیکھ کر سب لوگ سہم گئے۔
طوفان آگے بڑھتا رہا۔ اُس آدمی کا کٹا ہوا سر دور ہوتا گیا
دن مغرب میں ڈوبنے لگا۔ درختوں کے سائے لمبے ہو کر
دھندلکوں میں کھو گئے، پھر رات کے اندھیرے پھیل گئے۔ طوفان
بدستور بڑھ رہا تھا۔ راستے کے دونوں طرف اُگے ہوئے درخت
جابر کے خوف سے سہمے ہوئے چپ چاپ دم سادھے کھڑے تھے۔
جابر بڑبڑا رہا تھا۔ "رات بھی ہو گئی۔ صبح ہی تو اُس درویش
نے مجھے بتایا تھا کہ آج مجھے بہت زیادہ دولت ملنے والی ہے۔ کہاں
ہے وہ دولت؟ کب ملے گی آخر؟ درویش جھوٹ نہیں بول سکتا
مجھے اُس کی بات پر پورا اعتبار ہے۔ مگر ابھی تک تو صرف ویران بستیاں
ہی ملی ہیں!"

طوفان اب ایک بستی میں داخل ہو رہا تھا۔ سارے مکان
سُونے پڑے تھے۔ ہر طرف اندھیرا تھا، سناٹا تھا

"آگ لگا دو۔ ایک مکان بھی نہ بچنے پائے۔" جابر دھاڑا۔
اندھیری بستی میں آگ کی لپٹیں اُٹھنے لگیں اور طوفان
آگے بڑھ گیا۔

چند میل اور آگے بڑھنے کے بعد اچانک جابر رُک گیا۔
تاروں کی مدھم روشنی میں بہت سے مکان نظر آرہے تھے

جو سب کے سب تاریک تھے۔ اور اُن میں ہی روشنی کا وہ دھبا نظر آرہا تھا جسے دیکھ کر وہ ایک دم ٹھہر گیا تھا۔ اُس کے ساتھیوں نے بھی گھوڑوں کی باگیں کھینچ لیں۔

"بستی ہے، حضور" ایک بولا۔

"ہوں ــ" جابر نے کہا ــ "مگر وہ ــ وہ روشنی؟"

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

جابر کہہ رہا تھا "ساری بستی اندھیری پڑی ہے، صرف ایک گھر میں روشنی ہے۔ یہ کیا راز ہے؟ آخر کون ایسا جیالا ہے جسے جابر کا خوف نہیں؟ عجیب بات ہے، بہت عجیب! تم سب یہیں ٹھہرو، میں دیکھ کر آتا ہوں۔"

"مگر ــ مگر آپ اکیلے" چند آوازیں آئیں۔

"ہاں" جابر نے جواب دیا "کوئی اکیلا اس بستی میں جابر کے مقابلے کے لئے موجود ہے، اس لئے جابر بھی اکیلا ہی جائے گا۔"

اُس نے گھوڑے سے اُتر کر تلوار سونتی اور اندھیرے میں گم ہو گیا۔

ایک بوسیدہ سی جھونپڑی میں چراغ جل رہا تھا۔ ایک بوڑھی عورت ٹوٹی ہوئی چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھی ــ وہیں ایک نوعمر لڑکا بھی موجود تھا۔

"پ ــ پانی ــ!" عورت نے کراہتے ہوئے کہا۔

لڑکے نے مٹی کے گھڑے میں سے پانی نکال کر خود اُسے پلایا۔

عورت نے آنکھیں کھول دیں۔

"تو ــ حامد ــ تو!" وہ حیرت سے بولی۔ "تو نہیں گیا؟"

"گیا تھا" لڑکا کہنے لگا۔ "سب کے ساتھ میں بھی بھاگ رہا تھا مگر پھر میں نے سوچا کہ کسی نے تمہارا خیال نہیں کیا، سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ تم بیمار ہو، چل پھر نہیں سکتیں اس لئے واپس چلا آیا۔"

"چلا جا! فوراً چلا جا!" عورت نے بے چین ہو کر کہا۔

شکریہ ــ میں بہت پریشان تھا کہ درخت سے کیسے اُتروں گا

"وہ بھیڑیا آتا ہی ہوگا۔ تجھے زندہ نہ چھوڑے گا۔ بھاگ جا! ابھی تو نے زندگی کی کیا بہار دیکھی ہے۔ میرا کیا ہے؟ اگر آج جابر کے ہاتھوں نہ مری تو کل اپنے آپ ختم ہو جاؤں گی۔ مگر تُو تو اپنی جان بچا سکتا ہے۔ جا، بیٹا۔ ابھی چلا جا۔"

"بوڑھی اماں" لڑکا بولا۔ "یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ ایسی جان بچا کر کیا کروں گا کہ تمہیں موت کے مونہہ میں چھوڑ جاؤں۔ نہیں نہیں، میں نہیں جا سکتا۔ انسان تو وہی ہوتا ہے نا جو دوسروں کے کام آئے، جو دوسروں کے لئے اپنی جان تک قربان کر دے۔ تم بستی کے بچوں سے کتنا پیار کرتی تھیں۔ اُنہیں مزے مزے کی کہانیاں سناتی تھیں۔ وہ سب اپنے اپنے ماں باپ کے ساتھ بھاگ گئے۔ مگر میں لوٹ آیا۔ تم جانتی ہو میں یتیم ہوں، میرا کوئی نہیں۔ تم مجھے اپنے بیٹے کی طرح چاہتی تھیں، میں اس آڑے وقت میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ جابر آتا ہے تو آنے دو۔ میں اُس سے نہیں ڈرتا۔ ڈریں تو وہ جنہیں زندگی پیاری ہے۔

جو لوگ دوسروں کے لئے جیتے ہیں،
اُنھیں اپنی جان کی پروا نہیں

ہوتی۔"

"تو دیوانہ ہوگیا ہے۔" عورت نے ممتا بھری جھلاہٹ سے کہا "تو نا سمجھ ہے۔ جابر بہت خوف ناک ہے۔ اُسے خون کی پیاس ہے بھاگ جا۔"

"پریشان نہ ہو۔" لڑکے نے مسکرا کر جواب دیا۔ "سنا ہے مارنے والے سے بچانے والا بہت بڑا ہے۔ جنگل میں جب شیر باہر آتا ہے تو دوسرے جانور اپنی جانیں بچا کر اِدھر اُدھر بھاگ جاتے ہیں، مگر میں تو انسان ہوں۔ انسان جانوروں سے بہت بلند ہوتا ہے۔ اگر میرا خون بہا کر جابر کی پیاس بجھ جائے تو اچھا ہی ہے، تاکہ وہ ظلموں سے باز تو آجائے۔ اب تم سونے کی کوشش کرو۔ بھول جاؤ کہ جابر آنے والا ہے۔ تم بہت بیمار ہو۔ کچھ مت سوچو۔"

لڑکا اُس دیو پیکر اجنبی کو نہ دیکھ سکا جو دیر سے دروازے میں کھڑا ساری باتیں سن رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔

اجنبی نے تلوار میان میں رکھ لی۔ سرسراہٹ سے لڑکے نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"کون ہو تم؟"

"ایک اجنبی ـــــ بہت پیاسا ہوں۔"

"آجاؤ اندر۔" لڑکے نے کہا اور ایک ٹوٹی پھوٹی چٹائی فرش پر بچھا دی۔ اجنبی چٹائی پر بیٹھ کر ہانپنے لگا ـــــ

لڑکے نے مٹّی کے پیالے میں پانی بھر کر اجنبی کو دیتے ہوئے کہا ـــ "بھائی، پانی پیو اور جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے چلے جاؤ ـــ بہت دور جابر آج ادھر آنے والا ہے۔ بستی کے سارے لوگ جا چکے ہیں۔"

"تم کیوں نہیں گئے؟" اجنبی نے اپنا خوں خوار چہرہ اُٹھا کر پوچھا۔

"گیا تھا، مگر لوٹ آیا ـــ ان بوڑھی اماں کی وجہ سے میں یتیم ہوں۔ انھوں نے مجھے ہمیشہ ماں کا سا پیار دیا، پھر میں کس طرح انھیں چھوڑ جاتا؟ یہ بہت بیمار ہیں، چل نہیں سکتیں۔ اب تم خود ہی بتاؤ۔ جس انسان کے دل میں ہمدردی نہ ہو وہ انسان کیسا؟ ٹھیک ہے نا؟"

اجنبی کے دل کو ایک جھٹکا سا لگا۔

"تم جابر سے نہیں ڈرتے؟" اجنبی نے لڑکے سے نگاہیں چراتے ہوئے سوال کیا۔

لڑکا کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"جب میں بہت چھوٹا تھا تو ماں کہا کرتی تھی کہ اچھے کام کرنے والوں کو کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔ وہ یہ بھی کہتی تھی کہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقتور ہے۔"

"ہوں۔" اجنبی نے کہا اور ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کی برسہا برس کی پیاس بجھ گئی ہو ـــ اُس نے چراغ کی طرف دیکھا، جو طوفان سے نڈر ہو کر روشنی بکھیر رہا تھا جیسے وہ طوفان کا مذاق اُڑا رہا ہو۔

"تم نے چراغ جلایا ہے" اجنبی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "مگر جابر کا طوفان اسے بجھا دے گا۔"

لڑکا پھر ہنس پڑا، اور بولا "بھائی! تم نے آسمان میں جگمگاتے ہوئے ستاروں کو تو دیکھا ہی ہوگا۔ کتنی آندھیاں آتی ہیں، کتنی اندھیری گھٹائیں چھاتی ہیں، مگر نیلے آسمان کے یہ چراغ لاکھوں برس سے جل رہے ہیں۔ انھیں کوئی نہیں بجھا سکتا۔ سنا ہے ہمت والوں کے دلوں میں بھی ایسے ہی چراغ جلتے ہیں۔ جابر اگر چاہے تو اس مٹّی کے چراغ کو بجھا سکتا ہے، مگر میرے دل کا چراغ نہیں بجھا سکتا میں بزدل نہیں بن سکتا۔"

اجنبی حیرت سے لڑکے کو دیکھنے لگا۔ اُس کے معصوم چہرے پر فرشتوں جیسی مسکراہٹ تھی۔ پھر اجنبی کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ لڑکا خود چراغ بن گیا ہو جیسے نُور پھیلتا جا رہا ہو اور اندھیرے سمٹ رہے

ہوں۔ اُس کے سامنے دو چراغ روشن تھے۔ ایک مٹی کا تھا جسے جابر بجھا سکتا تھا۔ دوسرا ہمت اور بہادری کا۔ اس کو بجھانا جابر کے بس کی بات نہ تھی۔ کوئی آندھی کوئی طوفان اس کو نہیں بجھا سکتا تھا۔

نہ جانے کیوں اجنبی کانپ اٹھا تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور باہر چلا گیا۔ لڑکا اور بوڑھی دونوں حیرت سے اسے دیکھتے رہے۔

لڑکے نے باہر جھانک کر دیکھا، اور بے اختیار چلا اٹھا "ارے ارے! اجنبی کیا کر رہا ہے۔ یہ تو تمام گھروں کے چراغ جلاتا پھر رہا ہے۔ کیا پاگل ہوگیا ہے یہ؟"

لڑکا بے تحاشہ بھاگتا ہوا اجنبی کے پاس پہنچا اور اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا "یہ تم کیا کر رہے ہو؟ جابر دیکھ لے گا۔ چراغ نہ جلاؤ۔"

"چراغ سے چراغ جلنے دو میرے بچے۔" اجنبی نے کہا۔ "ان چراغوں کو جلنے دو۔ بزدل جابر ان کی طرف رُخ بھی نہیں کر سکتا۔ تم نے سچ کہا تھا، مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقت ور ہے۔"

اجنبی کی آنکھوں میں دو ستارے جھلملانے لگے۔ آنسوؤں کے دو قطروں میں چراغ کا عکس جھلک رہا تھا۔

"تم رو رہے ہو!" لڑکے نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

تمام چراغ روشن کر کے اجنبی واپس جانے لگا۔ جاتے جاتے اُس نے پکار کر لڑکے سے کہا۔

"بستی کے لوگوں سے کہہ دینا کہ جابر کا طوفان ان چراغوں کا سامنا نہیں کر سکتا، کبھی نہیں۔"

لڑکا دیر تک سوچتا رہا۔

اُدھر جابر کے ساتھی حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ بستی کے گھروں میں ایک ایک کر کے بے شمار چراغ روشن ہوتے چلے جا رہے تھے۔

"یہ کیا راز ہے؟ کون جلا رہا ہے ان چراغوں کو!" سامنے سے جابر اندھیرے میں چلا آ رہا تھا۔ سب لوگ گم صم کھڑے تھے۔ وہ تو اتنی

تمہیں آج سے "خان بہادر" بنا دیا گیا ہے

دیر سے انتظار کر رہے تھے کہ کب حکم ملے اور وہ بستی کو آگ لگا دیں۔

جابر خاموشی سے اُن کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔

"چلو واپس چلیں گے۔" وہ دھیرے سے بولا۔

لوگ حیران رہ گئے۔ اُس سے پہلے تو وہ کبھی لوٹ مار کیے بغیر واپس نہیں لوٹا تھا۔

جابر نے گھٹنے پر تلوار رکھ کر اُس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ سب نے دانتوں میں انگلیاں دبالیں۔

"ہاں ہم واپس چلیں گے۔" وہ کہہ رہا تھا: "مجھے اُن چراغوں سے خوف معلوم ہوتا ہے۔"

"ہائیں!" بے ارادہ سب کے مونہہ سے نکل گیا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ جابر کو بھی کسی چیز سے خوف ہو سکتا ہے۔

"ہاں۔ جابر ان چراغوں سے ڈرتا ہے۔" وہ گرجنے لگا۔ "وہ چراغوں کی بستی میں نہیں جا سکتا —— اور درویش نے ٹھیک کہا تھا۔" جابر نے گھوڑے پر سوار ہو کر باگیں موڑ دیں۔

اور طوفان چراغوں کی بستی سے دور ہوتا چلا گیا ——

اور چراغ مسکراتے رہے۔

■■

غلط تصویر

اس تصویر میں آرٹسٹ نے بہت سی چیزیں غلط بنادی ہیں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ کون کون سی چیزیں غلط بنی ہوئی ہیں؟ اپنا جواب ایک پوسٹ کارڈ (سال نامہ میں شائع ہونے والے تمام مقابلوں کے جواب علیحدہ علیحدہ کاغذ پر ایک ہی لفافے میں بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔) پر لکھ کر "غلط تصویر، ماہ نامہ کھلونا۔ آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۱" کے پتے پر بھیج دو۔ ۲۲، فروری ۱۹۷۳ تک ملنے والے صحیح جواب بھیجنے والے دس بہن بھائیوں دو دو روپے انعام دیتے جائیں گے۔

غلط تصویر، ماہ نامہ کھلونا، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۱

کھوٹا روپیہ

احمد جمال پاشا

روپیہ اپنے گول کنارے پر ایک کھنک کے ساتھ کھڑا ہوگیا، اُس پر بنی ہوئی پُتلی کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی، مونہہ کھُلا اور روپے نے کہنا شروع کیا:

"جناب والا! میں بدقسمت ایک کھوٹا روپیہ ہوں۔ لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ مجھے بنانے والا ایک ڈاکو تھا، اُس کا نام بھُتنا تھا۔ جیسے شیر بوڑھا ہونے کے بعد آدم خور ہو جاتا ہے،

اُسی طرح جب وہ بوڑھا ہوا اور اُس میں ڈاکے مارنے کا دَم نہ رہا تو اُس نے جعلی سکّے بنانے شروع کر دیئے۔ پیسے کی ایک سِل سے جو ایک کان سے لائی گئی تھی۔ مجھے کاٹ کر ایک سانچے میں ڈال دیا گیا۔ چھَن کی آواز کے ساتھ پانی کے ٹب سے نکال کر رانگ کی قلعی کی گئی تو میرے ایک طرف دہی تین

ثیر تھے' اور دوسری جانب خوشنما بیل' ملک کا نام' سنِ پیدائش اور قیمت وغیرہ چمک رہی تھی۔ اِس ہندوستانی فیشن کے لباس میں' مَیں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بالکل تازہ اور چمک دار۔ مجھے اپنے بہت سے بھائیوں کے ساتھ روپوں کے ایک ڈھیر پر ڈال دیا گیا۔ ہم سب ایک بورے میں بند ہونے والے ہی تھے کہ کوتوالِ شہر گارد لے کر آگیا۔ ڈاکو پکڑ لیا گیا۔ جو سپاہی روپے بورے میں بند کرکے سر بہ مہر کر رہا تھا' اُس نے موقع پاکر کچھ روپے پار کردیئے۔

دنیا میں آنے کے بعد مجھ میں سیر سپاٹے کی اُمنگ نے انگڑائی لی۔ میں چاہتا تھا کہ ہاتھوں ہاتھ دنیا کی سیر کروں اور طرح طرح کے لوگوں سے ملوں۔ مجھ میں کام کرنے کی اتنی زیادہ خواہش تھی کہ دنیا کا کوئی انسان اُس کا ہزارواں حصّہ بھی سوچ تک نہیں سکتا۔ ہم سکّوں کا کام ہی دراصل دنیا کو چلانے کے لئے خود چلتے رہنا ہے۔

ڈیوٹی ختم کرکے سپاہی ایک ہوٹل میں کھانا کھانے گھُس گیا۔ نکلتے وقت اُس نے مجھے مالک ہوٹل کے سپرد کیا۔ ہوٹل کے مالک نے مجھے ایک گوشت والے کو تھمادیا۔ گوشت والے نے مجھے ایک ترکاری والے کے' ترکاری والے نے دُودھ والے کے' اور دُودھ والے نے درزی کے حوالے کیا۔ غرض میں جس کے پاس بھی پہنچا وہ مجھے اُچھالنے کے بعد سمجھ گیا کہ مَیں کھوٹا ہوں' اِس لئے اُس نے جلدی سے مجھے دوسرے کے سر منڈھ دیا۔ تھا' تو میں کھوٹا مگر کھرے سے زیادہ چل رہا تھا۔ آخر کھوٹے لوگ بھی تو زندگی میں کھروں سے زیادہ چلتے ہیں۔ یہی زندگی کا اُصول ہے۔

مَیں نے دو سال میں' ملک کا ایک ایک کونا چھان مارا۔ دلّی کا قطب مینار دیکھا۔ آگرہ کا تاج محل دیکھا۔ بیجاپور کا گول گنبد دیکھا۔ لکھنؤ کا بڑا امام باڑہ دیکھا۔ غرض نہ جانے کیا کیا دیکھا۔ لیکن ستم یہ تھا کہ میں جس کے پاس بھی گیا' اُس نے مجھے گالیاں دیں اور کھوٹا کہہ کر شرم سے میرا سر جھکا دیا۔

افسوس کہ تیسرے سال میرا پالا ایک کنجوس بُڑھیا سے پڑا' جس نے مجھے ایک صندوقچی میں بند کرکے زمین کے اندر دبا دیا۔ میرے ایک سو ساتھی قید میں' میری ہی طرح اُداس تھے۔ ہر ہفتے بُڑھیا چپکے سے ہمیں نکال کر گنتی تو تھوڑی دیر کے لئے تازہ ہوا مل جاتی۔ ایک دن بُڑھیا کی بہو نے اپنی ساس کو روپیہ دباتے دیکھ لیا۔ اُس شریف عورت نے رات کو چپکے سے مجھے اور میرے کچھ ساتھیوں کو رہا کیا۔ ہمیں گنتے ہوئے اُس کے شوہر نے دیکھ لیا اور آدھے روپے رشوت کے طور پر لے لئے۔ اِن میں مَیں بھی تھا۔ شوہر نے ترنگ میں جاکر تاڑی پی اور مجھے بھٹّی والے کو ٹکا دیا۔ بھٹّی والے نے مجھے ایک جنرل مرچنٹ کے سر منڈھا۔ اُس نے روٹی والے کے اور روٹی والے نے ایک سیّاح کے حوالے کر دیا۔

سیّاح کے ساتھ میں شہروں شہروں گھومتا رہا۔ میرا سفر سیّاح سے بچھڑنے کے بعد بھی مونگ پھلی والے' بجلی والے' کپڑے والے' بُک اسٹال والے' ریلوے والے اور ٹیکسی والے کے ہاتھوں پر جاری رہا۔ میں لوگوں کی جیبوں' بٹوؤں' میزوں اور زمین پر بھی بکھر کے گھومتا رہا۔

اِس سفر کے دوران میرا پالا ایک بوڑھے سے پڑا جس نے مجھے اپنے بٹوے میں قید کرلیا۔ دراصل وہ مجھے اصلی سمجھ کر شگون کے طور پر رکھے ہوئے تھا۔ میری عزّت بنی ہوئی تھی۔ لیکن ایک دن اُسے میری اصلیت کا پتہ لگ گیا اور اُس نے مجھے ایک جگہ رشوت میں دے دیا۔ رشوت خور نے مجھے ایک اندھے فقیر کو پکڑا دیا جو بے چارہ میری وجہ سے بڑی مصیبت میں پھنس گیا۔ غرض جس کو بھی میرے کھوٹے پن کا علم ہوتا وہ مجھے کسی نیک کام میں لگا دیتا' جہاں مجھے ثواب کی جگہ گالیاں ملتیں۔

سب سے عجیب واقعہ یہ ہوا کہ ایک شخص کو ورثے میں اُس کے باپ کا قرض اور نقدی کی شکل میں صرف میں ملا۔ مجھے پاکر بھی

اس گلاب کے پودے تک تم کیسے پہنچ سکتے ہو؟

وہ بہت خوش ہوا۔ مگر جب اُس نے مجھے پرکھا تو غصّے کے مارے کانپنے لگا اور اُس نے مجھے اٹھا کر دُور پھینک دیا۔ میں ایک کونے میں مُونہہ کے بَل جا گرا۔ برسوں کسی کی مجھ پر نظر نہ پڑی۔ یہاں تک کہ مجھ پر کائی جمنے لگی اور رنگ و روغن رخصت ہونے لگا۔ کئی سال بعد ایک بھوکے کی مجھ پر نظر پڑی۔ اُس نے پہلے مجھے خوب چمکایا۔ پھر ایک ہوٹل میں گھس گیا۔ مگر کھانے کے پیسے دیتے وقت اُس کی شامت آگئی۔ پھر ہوٹل والے نے مجھے ایک نشے باز کو تھما دیا۔ وہ مجھے جوئے خانے میں دے آیا۔ جوئے خانے کے مالک نے مجھ سے پانسے کا کام لیا۔ یہ زندگی بہت تکلیف دہ تھی۔ اُس میں سونے کے وقت جاگنا اور جاگنے کے وقت سونا پڑتا تھا۔ یہاں میں نے لوگوں کی تقدیریں بگڑتے دیکھیں۔ ایک دن جوئے خانے کا ملازم مجھے لے اُڑا۔ اس رہائی کے بعد پھر میرا سفر شروع ہوگیا۔

گھومتے گھومتے میرا پالا ایک ظالم سُنارے پڑا۔ اُس نے میرے کونے کُتر لئے اور پیٹ پاٹ کر مجھے سڈول بنایا اور ایسا چمکایا کہ میں پھر کھرے سکوں کی طرح چلنے لگا۔

میری زندگی کے سفر کے واقعات میں ایک شاعر کی جیب میں جانا بھی شامل ہے۔ وہ مجھے پاکر اتنا خوش ہوا کہ اُس نے میری شان میں ایک قصیدہ لکھ دیا۔ میں ایک اندھے فقیر کو دیا گیا؛ جو میرے کھوٹ کو جان کر بہت ناراض ہوا۔

کچھ دن بعد مجھے ایک شخص کی جیب میں جگہ ملی جو کسی اور ملک کو جا رہا تھا۔ جب وہ جہاز سے اُترا تو مجھے دیکھ کر چلّایا: "ارے! یہ میرے ملک کا سکہ یہاں کیوں ہے؟ اور وہ بھی کھوٹا؟ کہیں میری منزل نہ کھوٹی کردے؟" پھر وہ قلی سے باتیں کرتے کرتے مجھے بھول گیا کچھ دن بعد میں ایک اور نئے ملک میں پہنچ گیا۔ دو ملکوں کے دس سکوں کا میرا ساتھ ہوا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اس طرح مجھے دنیا گھومنے اور نئے نئے لوگوں سے ملنے کا موقع ملے گا۔ ایک دن اندھیرے میں میرے

مالک نے مجھے کسی اور کو تھما دیا اور چلتا بنا۔ صبح صبح اُس آدمی نے مجھے دیکھ کر کہا "یہ کیا ہے؟ یہ ہمارے ملک کا سکہ تو نہیں۔ اور پھر یہ تو جعلی ہے۔ میرے لئے بالکل بے کار ہے"! اُس کے یہ الفاظ میرے کلیجے پر برچھی کی طرح لگے۔ اُس نے کہا "رات ہی کو میں اسے چلتا کردوں گا"۔ چنانچہ رات کی تاریکی میں اُس نے مجھے چلا دیا اور دن کی روشنی میں مجھ پر گالیاں پڑیں۔

میں جس ہاتھ میں بھی پہنچا اُس کی اُنگلیاں کانپنے لگیں۔ جس کے پلّے پڑتا وہ مجھے کسی نہ کسی کے سر منڈھ دیتا۔ میں کتنا غریب الوطن اور اُداس رو پیہ تھا۔ مگر اس کی کسے پرواہ تھی۔ سچ ہے بد اچّھا بدنام بُرا۔

ہر بار مجھے اپنے چلنے پر شرمندگی ہوتی۔ سب سے زیادہ شرمندگی مجھے اُس غریب عورت کے پاس پہنچ کر ہوئی جس کی دن بھر کی مزدوری کے بدلے مَیں اُسے ملا تھا بے چاری بڑی مصیبت میں پھنس گئی۔ اُس نے کہا "کم بخت کھوٹا سکہ! خیر میں کسی دوسرے کو نہیں پھنساؤں گی۔ کھوٹے لوگ تو خوب چلتے ہیں۔ لیڈروں کو دیکھو کیسے موٹے دُنبے کی طرح تیار نظر آتے ہیں۔ لیکن میں لیڈر نہیں غریب ہوں، مگر شریف ہوں ——" یہ کہہ کر اُس نے میری گردن میں ایک سوراخ کرکے

اُس میں ڈوری ڈال کر اپنے لڑکے کے گلے میں ڈال دیا۔ اب میں روپے سے زیادہ ایک میڈل لگ رہا تھا۔ لڑکا مجھے دیکھ کر مُسکرایا۔ دوسرے دن اُس نے ڈوری میں سے مجھے نکال کر میرا سوراخ بند کیا اور مجھے ایک راشن والے کو تھما دیا۔ اُس کے کیش بکس میں روپوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔

شام کو دکان دار نے مجھے پہچان لیا اور ایک ذخیرہ اندوز کے حوالے کیا۔ وہاں سے چور بازار کے گھر گیا' اور پھر ایک اسمگلر کے یہاں۔ اسمگلر نے مجھے ایکسائز انسپکٹر کی جیب میں پہنچا دیا۔ انسپکٹر نے مجھے پہچان کر ایک طرف ڈال دیا۔ ایک خراب آدمی کا دوسرے خراب آدمی سے یہ برتاؤ مجھے بہت کھلا۔ ایک سال تک میں اُسی طرح پڑا رہا پھر نکلا تو پانچ سال تک ہاتھوں ہاتھ ٹھوکریں کھاتا رہا۔

آخر مجھ پر ایک مسافر کی نظر پڑی۔ اس نے مجھے بہت غور سے دیکھا۔ ہنسا اور بولا "کیوں بھئی؟ تم یہاں کیسے؟ تم تو میرے ملک کے ہو؟ انہوں نے تمہیں سوراخ کر کے جعلی کیوں قرار دیا ہے؟ عجب مذاق ہے۔ میں تم پر ریسرچ کروں گا کہ ایک ملک کے سِکّے دوسرے ملک میں پہنچ کر جعلی کیسے ہو جاتے ہیں؟"

وطن پہنچ کر اس شخص نے جو پروفیسر تھا' مجھ پر ریسرچ نہیں کی' بلکہ مجھے اپنے بیٹے کے حوالے کر دیا' جسے سکّے جمع کرنے کا شوق تھا پھر میرا قیام اسی چوپال پر رہا جس میں دنیا بھر کے سکّوں سے میری میل ملاقات رہی۔ مگر اُس کے نوکر نے آج مجھے چُرا کر لاٹری کا ٹکٹ خرید لیا اور لاٹری والے نے مجھے آپ کے سپرد کر دیا۔

جیسے ہی سکّہ خاموش ہوا' میری آنکھ کھل گئی۔ دراصل میں آرام کرسی پر لیٹا اِس روپے کو دیکھ رہا تھا کہ یہ کھرا ہے یا کھوٹا۔ اتنے میں اونگھ گیا۔ اب میں جاگ رہا تھا۔ مگر کھوٹا روپیہ اگر سو نہیں رہا تھا تو خاموش ضرور تھا۔

■■

تصویر : اے ۔ ایل ۔ سید

تم "کھلونا" میں ہر ماہ انعامی تصویر دیکھتے ہو۔ اس تصویر کا کوئی عنوان نہیں ہوتا۔ اصل میں اس کا عنوان تم کو لکھنا ہے۔ تم اس کا کوئی خوبصورت سا دل چسپ عنوان سوچو اور ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ کر نیچے لکھے ہوئے پتے پر ہمیں بھیج دو۔ جس کھلونا بھائی بہن کا عنوان سب سے اچھا اور دل چسپ ہوگا اُسے دو روپے کی کتابیں انعام دی جائیں گی۔ پسند آنے والے اور بھی عنوانات شائع کئے جائیں گے۔

انعامی تصویر نمبر ۷۷ ، ماہ نامہ کھلونا ۔ آصف علی روڈ ، نئی دہلی

ہمیں جواب ملنے کی آخری تاریخ : ۱۵ - جنوری ۱۹۷۳

مسکرائیے

محنت

شوکت پردیسی
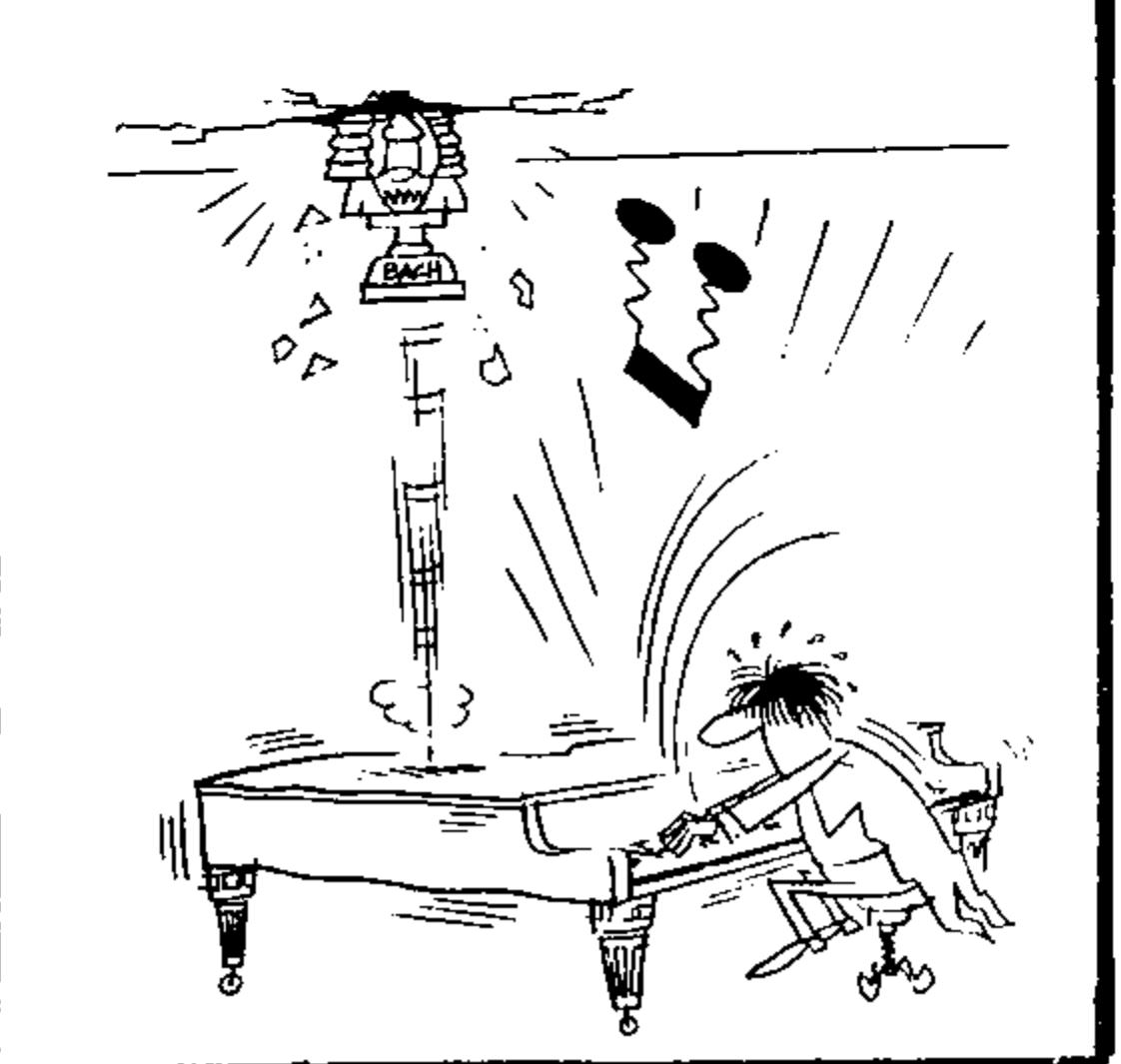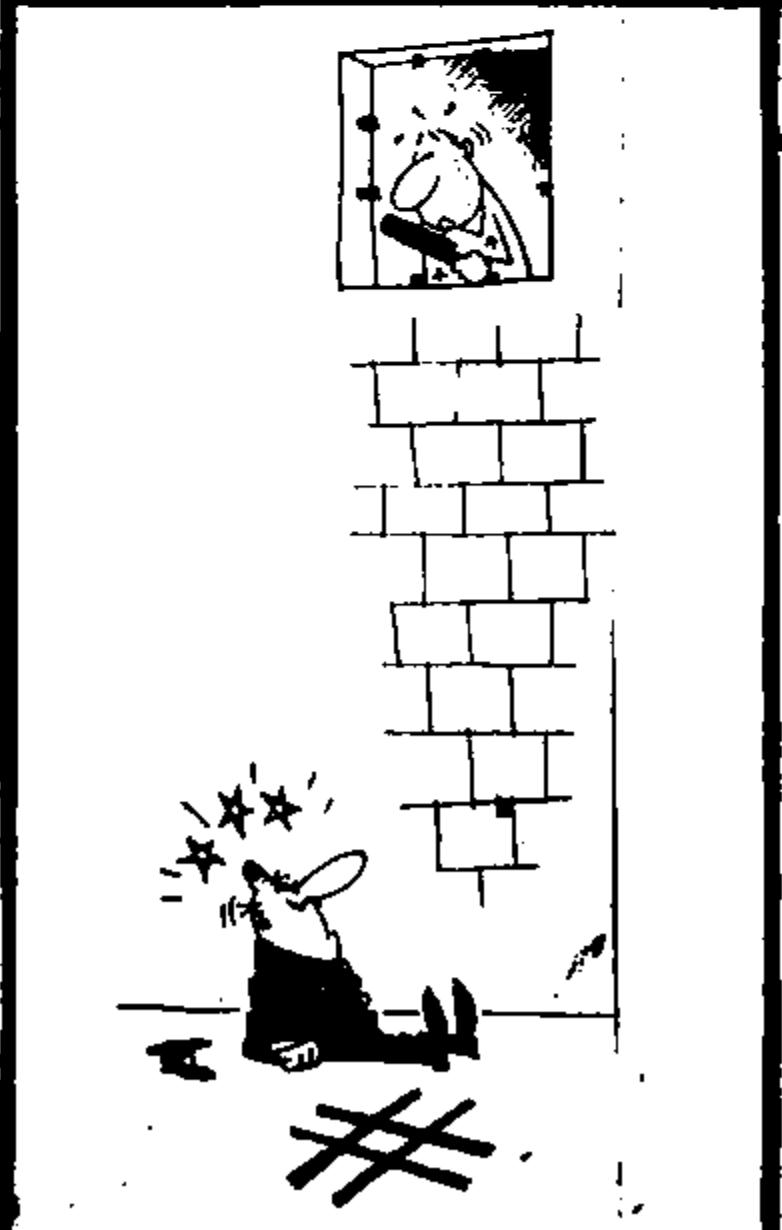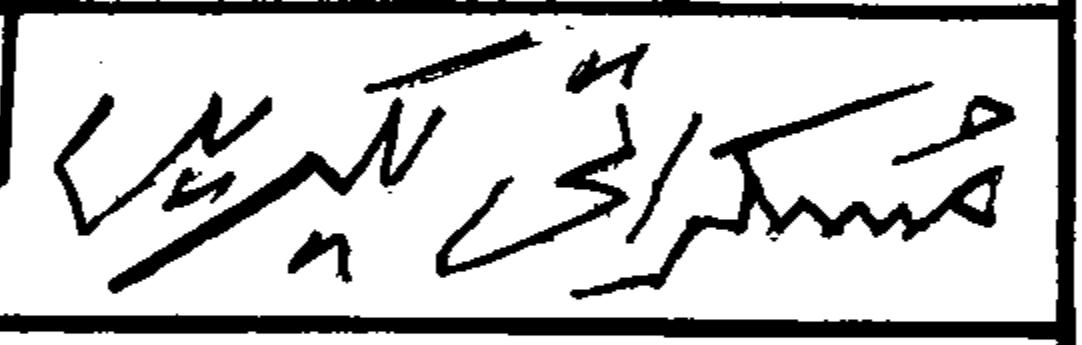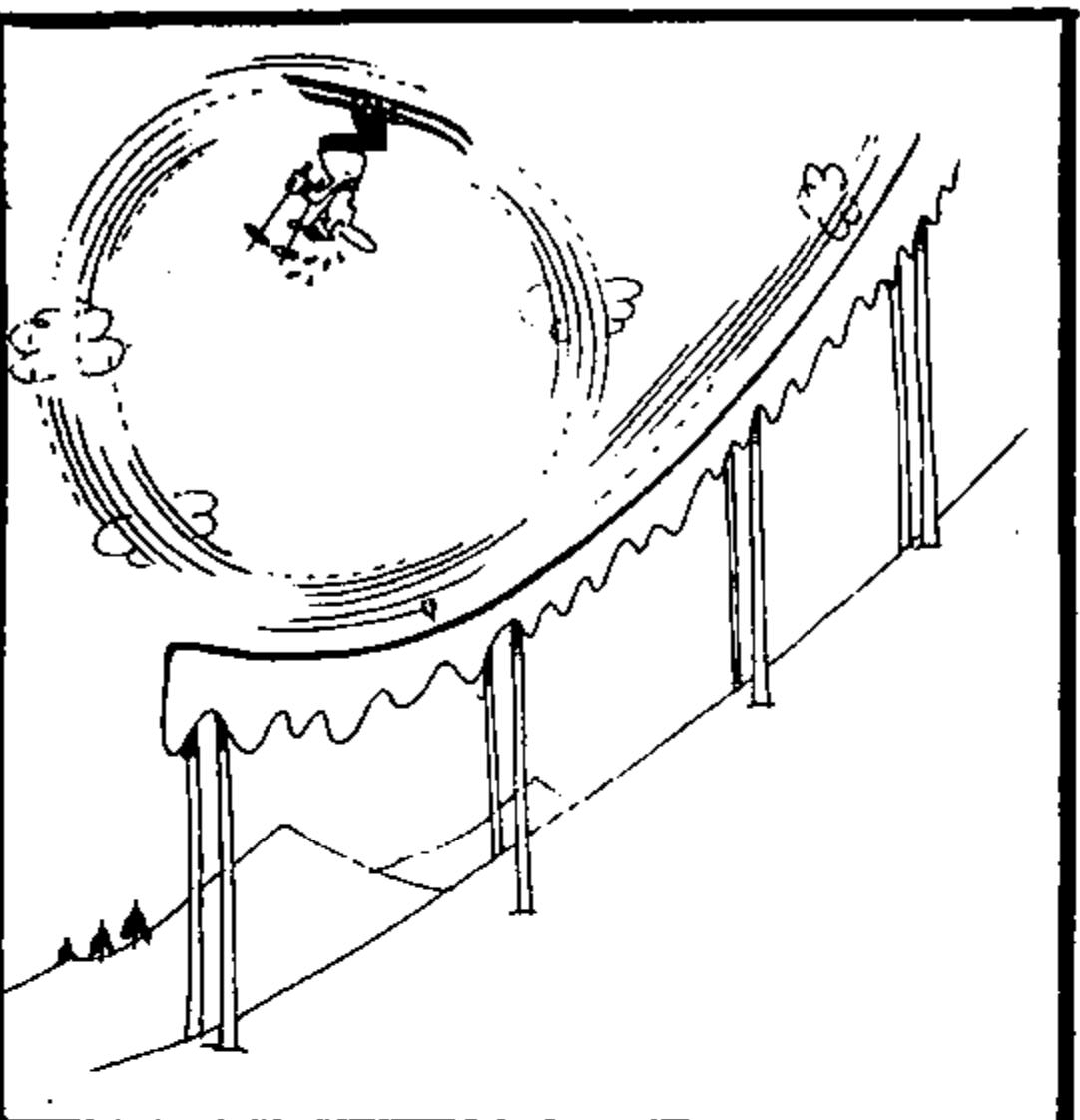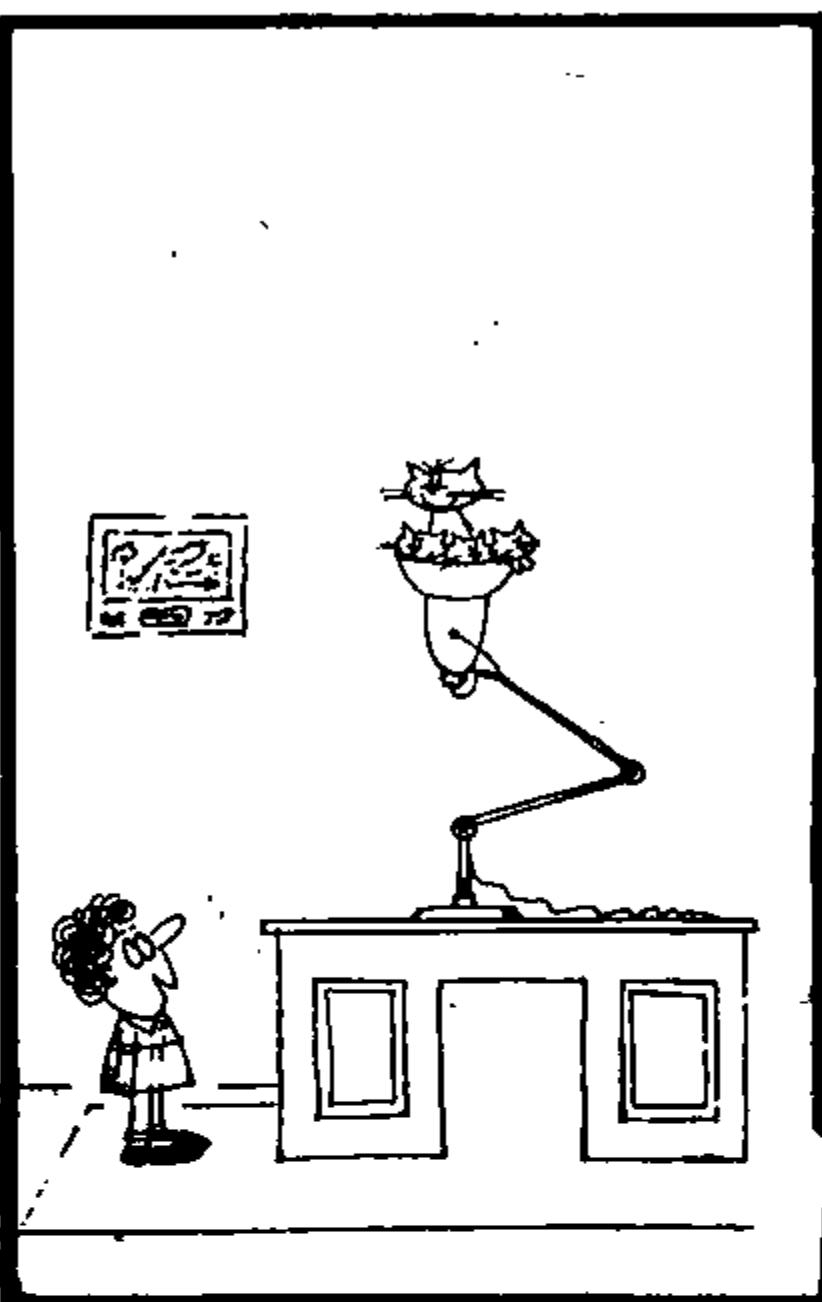
محنت اگر کرو گے دنیا میں نام ہوگا
ہرگز کبھی اُدھورا کوئی نہ کام ہوگا

اُس قوم کے خزانے دولت سے بھر گئے ہیں
محنت سے جس کے بچے غافل نہیں ہوتے ہیں
جو کام کر رہے ہیں، آگے ہی بڑھ رہے ہیں
دنیا میں اُن کا سب سے اُونچا مقام ہوگا
ہرگز کبھی اُدھورا کوئی نہ کام ہوگا

اِس کام کے جہاں میں بیکار ہو کے رہنا
خود اپنی زندگی سے بیزار ہو کے رہنا
اچھا نہیں ہے تم کو لاچار ہو کے رہنا
اُٹھو، قدم بڑھاؤ، رستہ تمام ہوگا
ہرگز کبھی ادھورا کوئی نہ کام ہوگا

یہ دَور تیز رو ہے، سُستی نہیں روا ہے
محنت سے بڑھنے والا کب راہ میں رُکا ہے
اِس عہد کا مُسافر یہ بات جانتا ہے
منزل اُسے ملے گی جو تیز گام ہوگا
ہرگز کبھی ادھورا کوئی نہ کام ہوگا

گر تم کبھی حوصلے سے دنیا میں کام لوگے
سُستی کو چھوڑ دو گے، محنت اگر کرو گے
راحت تمہیں ملے گی، دولت سے خُوش رہو گے
جاؤ گے تم جہاں بھی عزت سے نام ہوگا
ہرگز کبھی ادھورا کوئی نہ کام ہوگا

شرارت

روما اسکول واپس آئی تو آپا کو معمول کے مطابق اونگھتے ہوئے پایا۔ نیٹو اندر گڑیوں سے کھیل رہی تھی ــــ روما آپا کو جھنجھوڑتے ہوئے اور اس کے مٹاپے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی

"آپا، اٹھو بھی، اس طرح سوتی رہو گی تو اور موٹی ہو جاؤ گی"

آپا سچ مچ بہت موٹی تھی اور روما کو بات بات پر اس کے مٹاپے کا ذکر کرنے میں بہت مزہ آتا تھا۔

روما اور نیٹو دونوں بہنیں تھیں ــــ روما بڑی تھی اور نیٹو چھوٹی۔ نیٹو کو گڑیوں سے کھیلنے کا شوق تھا اور روما کو عجیب و غریب کھلونے جمع کرنے کا۔ ایسے کھلونے جن کا اصل کا گمان ہو اور آدمی چونک اٹھے۔ زیادہ تر یہ کھلونے جانوروں کی یا کیڑے مکوڑوں کی شکل کے ہوتے۔ مثلاً کاکروچ چھپکلی، مینڈک، چوہا۔ یعنی ایسے کھلونے جنہیں عام بچے پسند نہیں کرتے۔ وہ کسی بھی نمائش یا میلے میں جاتی، ایسے ہی کھلونے کی تلاش کرتی پھرتی۔ اور آپا کو ان کھلونے سے ایک طرح کی نفرت تھی۔ بس اسی بات پر روما اور آپا میں نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ آپا اور تو کچھ کر ہی نہیں سکتی ہے، روما کو جلانے کے لئے نیٹو کو طرح طرح کی گڑیاں بنا کر دیتی رہتی۔ ویسے وہ آئی بھی نیٹو کے لئے ہی تھی۔ نیٹو کی چھٹی روما سے دو گھنٹے پہلے ہو جاتی تھی۔ اس لئے آپا ہی اسے اسکول سے لے کر آتی تھی۔ اسے اسکول سے لانے اور ناشتہ کرانے کے بعد، آپا کے پاس کوئی کام نہ رہتا اور وہ تھوڑی دیر کے لئے یوں ہی بیٹھی بیٹھی سو لیتی۔ روما آتی تو جھٹ سے اسے جگا دیتی۔ اور بار بار اس کے مٹاپے کا مذاق اڑاتی رہتی۔ اس کی ممی نے اکثر اسے سمجھایا بھی تھا۔ "بیٹا، بڑوں کی عزت کرتے ہیں۔ ان سے اچھی طرح پیش آتے ہیں، چاہے وہ نوکر ہی کیوں نہ ہوں"۔ لیکن روما ممی کی نصیحت کو ایک کان سے سنتی، اور دوسرے کان سے نکال دیتی۔

روما نے نیٹو سے پوچھا کہ ممی کہاں ہیں۔ نیٹو نے بتایا "وہ تو سامنے کے اوپر والے فلیٹ کی گیتا آنٹی کے ساتھ ٹی شو دیکھنے گئیں ہیں"

ناشتہ کرنے کے بعد، روما کچھ دیر تو ہوم ورک کرتی رہی

بشیشر پردیپ

NASIM.

پھر اٹھی اور اپنے کھلونوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ ادھر اُس نے کچھ اور کھلونے خریدے تھے۔ مگرمچھ، پہاڑی بچھو، اُود بلاؤ اور بہت بڑی سی مکڑی۔ ان کھلونوں کو وہ ترتیب سے لگانے لگی۔ اتنے میں اسے پیاس لگی اور اس نے آیا سے پانی مانگا۔ لیکن آیا نے سنا ہی نہیں۔ چند منٹ بعد روما چلائی۔ "آیا، سنتی نہیں ہو؟ ہم نے پانی مانگا تھا۔"

"ابھی لائی بی بی۔" آیا نے کہا، لیکن اٹھنے میں بھی اُس نے چند منٹ اور لگا دیے۔ روما نے دیکھا کہ آیا ایک بہت بڑی گڑیا بنا رہی ہے، یہ دیکھ کر وہ چڑ سی گئی اور بڑبڑانے لگی "جب دیکھو یا تو سو رہی ہے، یا گڑیا بنا رہی ہے۔ میری بات تو سنتی ہی نہیں ہونہہ!"

پانی پینے کے بعد جب وہ دوبارہ اپنے کھلونوں سے کھیلنے لگی تو اس کا موڈ بہت خراب ہو رہا تھا۔ اسے آیا پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اچانک اسے ایک خیال آیا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ ایک شرارت آمیز مسکراہٹ ــــ اس نے نیٹو کے کان میں کچھ کہا اور نیٹو بھی مسکرا دی۔

مکان کے صحن میں، ایک طرف ایک چھوٹی سی کوٹھری

دشمن ملک کے سفارت خانے کو بم سے اڑانے والا

تھی۔ آیا رات کو وہیں سوتی تھی۔ گڑیاں بنانے کا سامان، کپڑے کے ٹکڑے وغیرہ وہ اپنی کوٹھری میں ہی رکھتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد آیا جو اپنی کوٹھری میں سے کچھ سامان لینے گئی تو ایک دم بوکھلا کر باہر نکلی اور چیخی:۔

"سانپ!"

روما اور نیٹو ایک دوسری کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں، مگر چپ رہیں انہوں نے آیا کو اپنی کوٹھری میں پھر جاتے دیکھا تھوڑی دیر کے بعد آیا باہر آئی تو اسی وقت روما اور نیٹو کی ممی بھی آ گئیں۔ آیا کے چہرے پر ہوائیاں اڑتے دیکھ کر انہوں نے پوچھا: "کیا بات ہے، آیا؟"

"ارے بی بی جی — آج تو ہم بوت ڈر گئیں۔ ابھی جو ہم اپنی کوٹھری میں گئیں تو کا دیکھت ہیں کہ کوٹھری کے بھیتر دیوار کے پاس یہ بڑا سانپ بیٹھا ہے — کالا سیاہ — ہمار تو دل دھک سے رہ گیا۔

ہم جلدی سے باہر آ گئیں۔ پھر ہمت بٹور کر کوٹھری کے بھیتر گئیں — کپڑے دھونے والا جو ہمار سونٹا ہے نا۔ وہ اب کی ہاتھ میں لے لین۔ سانپ وہیں بیٹھا رہا — اب جو ہم سونٹا کھٹکھٹائین، سانپ ہلوا ہی نہ کرا — وہیں جما بیٹھا رہا اور ہمار طرف دیکھت رہا۔ یوں ٹک سے — گول گول چمک دار آنکھیں۔ پہلے تو ہم ڈر گئین پھر ہمت بٹورین — اور یوں زور سے سونٹا مار دیں۔ سانپ پھر بھی ناہیں ہلا۔ ہم سمجھ گئین کہ بے ہوس پڑا ہے۔ دھیرے دھیرے جو پاس میں گئین تو مالوم ہوا۔ سچ مچ بے ہوس پڑا ہے اور ہم یوں دم سے پکڑ کر اٹھا لیں اور اپنی دھوتی کے پلو میں باندھ لیں یہ رہا"

آیا نے جھٹ اپنی دھوتی کا پلو روما کے اوپر جھاڑ دیا۔ روما جو آیا کی بات سن کر مسکرا رہی تھی، ایک بار ڈر کر پیچھے ہٹی — روما کی ممی بھی ڈر گئیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ پوری بات سمجھ گئیں۔

زمین پر جو سانپ گرا تھا۔ وہ ربڑ کا تھا اور روما نے دو ہی روز پہلے خریدا تھا۔

آیا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ روما کی ممی نے جب روما کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ شرم سے لال ہو رہا تھا۔ ●●

روما اور نیٹو نے پھر مسکرا کر ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ ان کی ممی کے چہرے پر پریشانی کے نشان ابھر آئے — آیا کہہ رہی تھی:

ورنہ اسی تنخواہ پر

غلام احمد فرقت

(نواب صاحب کی ڈیوڑھی پر دو ملازمین میں تنخواہ کی کمی اور دیر سے ملنے پر تیز تیز باتیں ہو رہی ہیں۔ ایک مُلازم نواب صاحب سے بغاوت پر آمادہ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اُسے مہنگائی کے پیشِ نظر دُگنی تنخواہ ملنا چاہیے اور پابندی سے مہینے کی پہلی تاریخ اس کے ہاتھ میں تنخواہ آجانا چاہیے)

مُجّن : اَب تو چاہے نوکری رہے یا جائے نواب صاحب سے موُنہہ در موُنہہ دو ٹوک باتیں ہوں گی ۔ یا اس سرے یا اُس سرے ۔ گرہ میں دھیلا نہیں اور چلے ہیں نواب کی دُم بننے ۔

بفاتی : بھیّا مُجّن، ذرا غصّے پر قابو رکھو ۔ نواب صاحب ابھی ابھی کچہری سے واپس آئے ہیں ۔ بڑے غصّہ ور آدمی ہیں ۔ پرسُوں غلام علی کے بڑے لڑکے کو جو پہلوان بنا بنا گھومتا ہے ایسی چار چوٹ کی مار دی ہے کہ ابھی تک ہلدی تھوپے پڑا ہائے ہائے کر رہا ہے اور اچھّا ہونے کے بعد بھی جب پروائی چلے گی مرنے لیتا رہے گا ۔

یہ سب ڈیزائن دیکھنے میں ایک جیسے ہیں۔ لیکن اس میں ایک مختلف ہے۔ وہ کون سا ہے؟ —
جواب صفحہ ۸۱ پر دیکھو

جمن : ارے جاؤ جاؤ۔ کہاں کی باتیں کر رہے ہو۔ وہ زمانہ گیا جب خلیل شاہ فاختہ اُڑاتے تھے۔ اب تو خلیل شاہ کو فاختہ اُڑائے گی۔ ایسی نوکری کو جمن خاں جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں۔ پندرہ ٹکلی اور وہ بھی قسطوں میں۔ چار رُوپے آج لے جاؤ۔ دو رُوپے کل لے جاؤ۔ اب تو نواب صاحب کو سَو کی غرض ہوگی تو پچیس رُوپے جمن خاں کی ہتھیلی پر پہلی تاریخ کو رکھنا ہوں گے۔ نہیں تو ایسی ملازمت کو جمن خاں دُور سے سلام کرتے ہیں۔ بڑے نواب کے بچے بنے ہیں۔ اگر ذرا بھی جمن خاں سے ٹرٹر کی تو جمن خاں ساری نوابی اُسی وقت نکال دیں گے۔

بفاتی : بھیا جمن۔ اتنے بے قابو نہ ہو ہوش کی باتیں کرو۔ یہ کیا اول فول نواب صاحب کی شان میں بک رہے ہو اپنی ملازمت تو ختم کراؤ گے ہی مگر دوسروں نے تمھارا کون سا باپ مارا ہے جو اُن کی روزی کے پیچھے پڑے ہو۔

جمن : (مونچھوں پر تاؤ دے کر) اب تو پھیلا ہو کر رہے گا۔ اگر نواب نے کہا کہ دس رُوپے اب لے لو، باقی بعد میں دے دیئے جائیں گے تو جمن خاں فوراً دس رُوپے نواب کے مونہہ پر تڑاتڑ سے رسید کریں گے اور پھر یہ جا اور وہ جا۔ ملازمت پر لات ماریں گے۔ اور اگر اُنھوں نے تنخواہ بڑھانے سے انکار کیا تو جمن خاں بھی دبنے والے نہیں۔ نواب صاحب کے کلّے چیر کر رکھ دیں گے۔ تم نے ابھی پٹھان کا غصّہ دیکھا کہاں ہے۔

بفاتی : اچھا چھوڑو دوسری باتیں کرو۔

جمن : جمن خاں دوسری بات نہیں سنتے۔ اگر نواب صاحب کہیں گے کہ تنخواہ تو نہیں بڑھے گی تو جمن خاں کا جواب ہوگا کہ وہ تو بڑھ کر رہے گی۔ اگر نواب صاحب نے یہ کہا کہ اگلے مہینے دیکھا جائے گا تو جمن خاں کہیں گے کہ آج سے ایک دن آگے کام کرنے والے پر لعنت۔ اگر نواب صاحب نے کہا کہ بیگم سے مشورہ کرکے بتایا جائے گا تو جمن خاں کا جواب ہوگا کہ بیگم صاحبہ پر لعنت۔ ہم کو ایسی ایسی پچاس نوکریاں مل جائیں گی۔ اگر نواب صاحب نے کوئی اِدھر اُدھر کی بات کی تو جمن خاں بھی پاجی پن میں نواب سے کم نہیں۔ اُسی وقت پکڑ کر اگر سر سے اونچا نواب کو نہ دے مارا تو اس دن سے جمن خاں

نہیں چار کہنا۔ خود تو دن رات پڑے پڑے مزے
کریں اور اِدھر جمن خاں کی تنخواہ بڑھنے کا سوال آیا
تو تن بدن میں آگ لگنے۔ نواب صاحب اب کی بار
بول کر تو دیکھیں۔ نہ مونہہ پر اُلٹا ہاتھ دیا ہو تو
جمن خاں نہیں بھنگی نام رکھنا۔

بُفاتی : اچھا تو چپکے چپکے بول۔ اگر نواب صاحب کے
کان میں ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی تو چرسا کھینچ کر
رکھ دیں گے اور گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جائے گا
تم تو روزی سے جاؤ گے ہی مگر ہمارا پتہ بھی کٹ
جائے گا۔ تمھاری قسمت میں تو ہم دیکھتے ہیں جوتیاں
چٹخانا لکھا ہے۔ منع کیا تھا ماش کی دال رات
میں نہ کھانا۔ یہ وہی ماش کی دال رنگ دکھا رہی ہے۔

جمن : ماش کی دال کھانے والے پر تین حرف۔ اب نواب
صاحب دکھائی پڑیں پھر دیکھنا کیسا تگنی کا ناچ نچاتا
ہوں۔ اگر انھوں نے پچیس روپے اور کھانے
سے کم کی بات کی تو میں صاف صاف کہہ دوں گا
کہ جاؤ اپنا راستہ پکڑو۔ ہمارے پاس اتنا وقت
نہیں جو تمھاری ڈیوڑھی پر پڑے رہیں۔ خدا کی
زمین تنگ نہیں ہے۔ خدا بھوکا اٹھاتا ہے بھوکا
سلاتا نہیں۔ ایسے ایسے نواب جوتیوں کی ٹھوکروں میں
بندھے ہیں۔

اتنے میں نواب صاحب جو بغل کے کمرے
میں بیٹھے جمن کی مونہہ زوری سن رہے تھے
غصے میں کانپتے ہوئے ڈیوڑھی میں پہنچ جاتے
ہیں اور ڈانٹ کر جمن سے کہتے ہیں۔

نواب صاحب : کیوں بے جمن کے بچے یہ کیا بکواس
لگا رکھی ہے۔ بتا مردود ابھی تو کیا کہہ رہا تھا؟

۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸

ان آٹھ موزوں کو غور سے دیکھو اور بتاؤ اس میں کون کونسے
موزے ایک جیسے ہیں؟۔

جواب صفحہ ۱۸ پر دیکھو

جمن : (ستٹ پٹا کر خوف سے کانپتے ہوئے) حضور!
ہم لوگ آج کل کی مہنگائی کے بارے میں یہ کہہ
رہے تھے کہ سرکار اگر مناسب سمجھیں تو تھوڑی بہت
تنخواہ ہم لوگوں کی بھی بڑھا دیں، تاکہ ہمارے بچے حضور
کی جان و مال کو دعائیں دیں، ورنہ۔

نواب صاحب : ورنہ تو کیا کرے گا بول!

جمن : حضور! ہم غریبوں کی کیا مجال ہے کہ حضور کے مونہہ
آئیں۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ تھوڑی تنخواہ بڑھ جائے ورنہ۔

نواب صاحب : ورنہ تیرا کیا ارادہ ہے؟ بتا اور جلد بتا۔
نہیں تو ابھی تیری کھال اُدھیڑ کر رکھ دیتا ہوں۔۔۔

جمن : ورنہ حضور اسی تنخواہ
پر کام کروں گا۔

چوہے بلّی

بی مانو جیسے ہی گھر میں داخل ہوئیں تمام چوہے باہر بھاگ گئے اور اِدھر اُدھر چھُپ گئے۔ کیا تم بی مانو کی مدد کرتے ہوئے بتا سکتے ہو کہ کتنے چوہے چھُپے ہوئے ہیں؟ اپنا جواب ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ کر "چوہے بلّی ماہ نامہ کھلونا، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر۱۱۰۰۰۱ کے پتے پر ۲۲، فروری ۱۹۷۲ء تک بھیج دو۔ (سال نامہ میں شائع ہونے والے تمام مقابلوں کے جواب علیحدہ علیحدہ کاغذ پر ایک ہی لفافے میں بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔) صحیح جواب بھیجنے والے دس بہن بھائیوں کو دو دو روپے نقد انعام دئے جائیں گے۔

چوہے بلّی، ماہ نامہ کھلونا، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۱

سعادت نظیر

عِلم کیا ہے؟ فِکر کا ہے ایک نُور
عِلم سے ہوتی ہے رَوشن دِل کی راہ
ایک بُنیادی تقاضا عِلم ہے
اِک حقیقت ، اِک فسانہ ہے کتاب
کتنی معلومات کا گھر ہے کتاب
ذہن میں آتی ہے اِس سے روشنی
ہوتی ہے یہ آئینہ جذبات کا
دیتی ہے تسکین دِل کو غم میں یہ
یہ ہر اِک کی دوست یوں خلوت میں ہے
ہے بجا ، اِس کو اگر ہمدم کہیں
آگہی کا ایک دفتر ہے کتاب

جس سے جاگ اُٹھتا ہے اِنساں کا شعور
جگمگا اُٹھتی ہے مُستقبل کی رَاہ
اَصل مقصد زِندگی کا ، عِلم ہے
عِلم کا گویا خزانہ ہے کتاب
ایک بے پایاں سَمندر ہے کتاب
رُوح کو مِلتی ہے اِس سے تازگی
یہ بدل دیتی ہے رُخ حالات کا
کس قدر ہم دَرد ہے عالم میں یہ
جیسے کوئی بَزم میں ، جلوت میں ہے
سیکڑوں خوشیوں کا باعث ہم کہیں
شوق کی منزل کا رہبر ہے کتاب

شَب کی ظُلمت میں اُجالا ہے کتاب
روشنی کی ایک دنیا ہے کتاب

NASIM..

آپریشن کی پوری تیاری مکمل ہے۔ تشریف لائیے ـــــ مگر آپریشن تکلیف دہ ہوتا ہے، اس پر آپ کا بہت سا روپیہ اور وقت بھی صرف ہوگا۔ ممکن ہے آپریشن کے بعد آپ کو کئی روز ہسپتال میں بھی رہنا پڑے۔ لیکن اگر گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم اور ٹونسل کی شکایت رہتی ہے تو بہتر ہے کہ آپ ٹونسلیکس استعمال کریں۔ چھوٹے بچے بھی اسے استعمال کر سکتے ہیں کیوں کہ کھٹی میٹھی چیزیں کھانے سے اُن کے گلے بھی اکثر خراب رہتے ہیں۔ اس دوا کا ہر گھر میں رہنا بہت ضروری ہے ـــــ اب آئندہ آپ کو، آپ کے کسی دوست عزیز کو، آپ کے بچوں کو گلے کی کوئی بھی شکایت ہو تو ' ٹونسلیکس ' کا استعمال کر کے ضرور دیکھئے، پھر آپ کو آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

قیمت: تین روپے

بنانے والے: **شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیباریٹریز، لال کنواں، دہلی ٦**

گناہ گار کون؟

اطہر پرویز

بہت دنوں کی بات ہے، ایک شیر، ایک چیتا، ایک کتا اور ایک گدھا — یہ چاروں میدان میں بیٹھے تھے۔ سورج بڑی تیزی سے چمک رہا تھا۔ کافی دن سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ پانی کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا۔ ندی نالے سوکھنے لگے تھے کھیتوں میں دھول اڑنے لگی تھی اور کھانے پینے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔"

شیر نے کہا" یہ کیا معاملہ ہے؟ ایسا کیوں ہے؟ بارش کیوں نہیں ہوتی؟ ہمارے لئے تو کھانا پینا تو مشکل ہو گیا ہے؟"
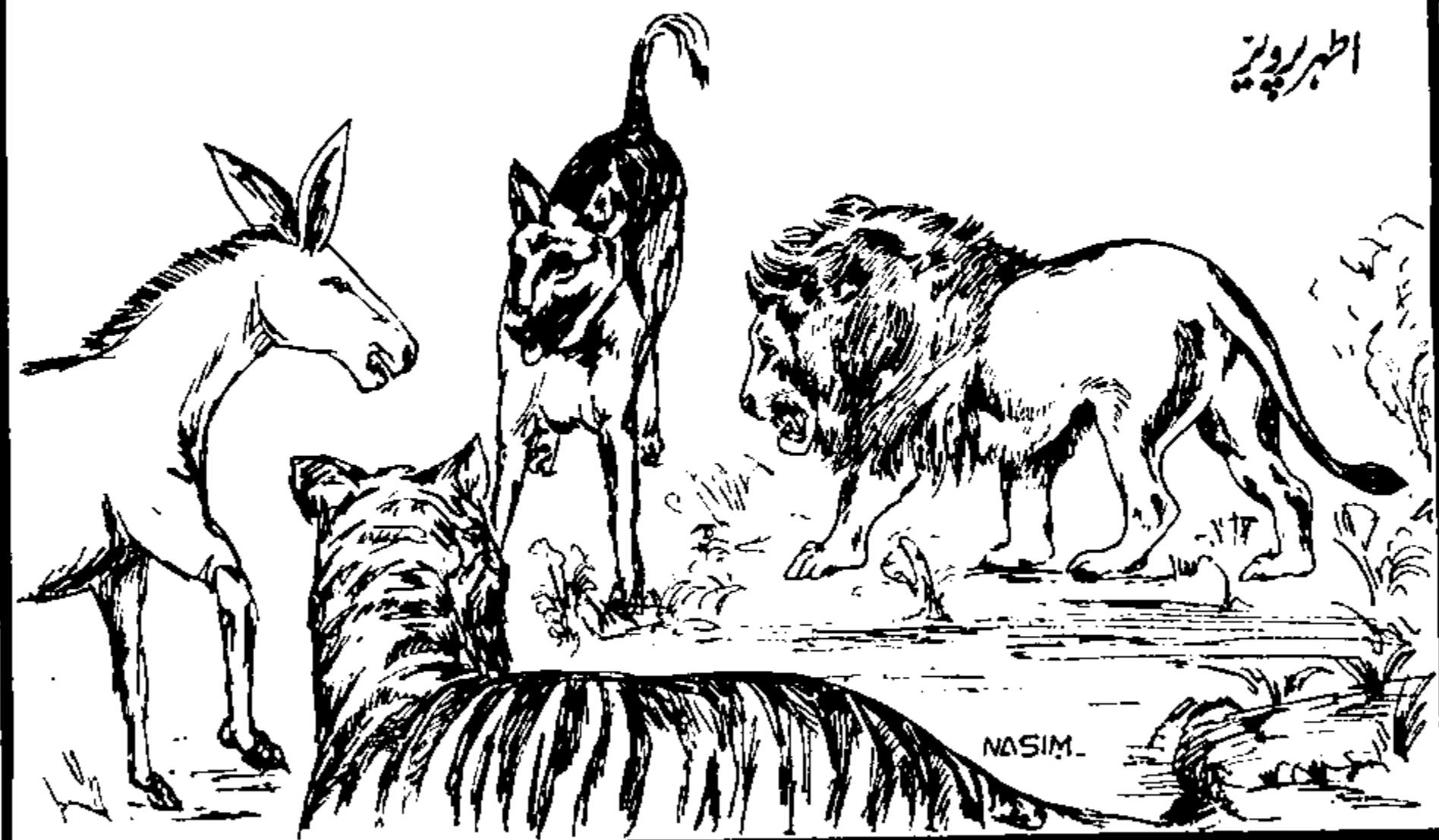
گدھے نے کہا" ایسا لگتا ہے کہ ہم میں سے ایک ایسا ہے جس نے کوئی بڑا گناہ کیا ہے۔"

شیر بولا "ہاں، ہم میں سے کسی نے کوئی بڑا گناہ کیا ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے۔"

چیتے نے لقمہ دیا" اور کیا — ضرور کسی نے گناہ کیا ہے۔"

کتے نے سر ہلا کر کہا" سچ ہے ایک کا گناہ سب کی تباہی کا سبب ہے۔"

گدھے نے رائے دی" بہتر ہو کہ ہم اپنے اپنے گناہ کا حال سنائیں۔ پھر خدا ہم کو معاف کر دے گا۔"

شیر نے سنانا شروع کیا:

" میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے۔" مجھے ایک غریب آدمی کی گائے گاؤں کے پاس چرتی ہوئی ملی تھی۔ اور میں نے اسے مار کر کھا لیا۔"

تینوں جانور شیر سے ڈرتے تھے، بولے" نہیں — نہیں، یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ تم نے ایک کمزور ہی کو تو مارا۔

NASIM

جانوروں کو کھانے کا سامان دینے کی
ممانعت ہے اس لئے میں نے
پینے کی چیز دی ہے۔

—نہیں— یہ گناہ نہیں ہے۔"

اب چیتے کی باری تھی۔ وہ بولا "میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ ایک بوڑھی عورت جنگل میں اپنی بکری لئے چلی جا رہی تھی۔ میں نے جو اس پر جھپٹا مارا تو وہ بوڑھی عورت بھاگ نکلی اور میں نے اس کی بکری کو مار کر کھا پی کے برابر کر دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس عورت کی گذر بسر اس بکری کے دودھ پر تھی۔ وہ دودھ بیچ بیچ کر اپنا پیٹ پالتی تھی۔"

یہ سن کر سب جانور ایک آواز ہو کر بولے "نہیں نہیں، یہ بھی کوئی گناہ ہے۔ تم نے بکری ہی کو تو مارا، بڑھیا کو تو نہیں مارا۔"

چیتے نے کہا "ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ بڑھیا کو میں نے نہیں مارا۔ وہ تو اپنی موت آپ مرگئی۔"

سب نے پھر ایک ساتھ کہا "پھر تو یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔"

اب باری آئی کتے کی۔ اس نے کہا "ایک لڑکی نے ایک بلی پال رکھی تھی۔ اسے اس بلی سے بہت محبت تھی۔ مجھے جو موقع ملا تو میں نے اس کی بلی کو مار دیا۔"

جانوروں نے پوچھا "پھر اس لڑکی کا کیا ہوا؟"

کتے نے جواب دیا "لڑکی بہت روئی، بہت روئی۔ مجھے اب بھی جب اس لڑکی کا خیال آتا ہے تو بہت افسوس ہوتا ہے۔ یہ میرا بہت بڑا گناہ ہے۔"

لیکن تینوں جانوروں نے کہا "ارے یہ گناہ نہیں ہے۔ لڑکیوں کی تو عادت ہی رونے کی ہوتی ہے وہ تو بے بات کے روتی ہیں۔ اگر ایک بلی کے لئے رو لیں تو کیا ہے۔ اس میں تو کوئی گناہ نہیں ہے۔"

اب تینوں جانور گدھے کی طرف دیکھ کر بولے "ہاں بھائی تم بتاؤ۔ اب تم بتاؤ۔ تم بڑے تیز ہو۔ تم نے ضرور کوئی گناہ کیا ہوگا۔"

گدھے نے کہا "میرا مالک ایک روز مجھے لے کر جا رہا تھا۔ راستے میں اس کا ایک دوست ملا۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں کچھ دیر تک تو چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر میں نے سڑک کے کنارے کی گھاس چرنا شروع کر دی۔"

سب جانور ایک زبان ہو کر بولے "اوہ! یہ تھا گناہ! بہت بڑا گناہ! اب پتہ چلا کہ خدا ہم سے کیوں ناراض ہے اور کیوں بارش نہیں ہو رہی ہے۔"

یہ کہہ کر تینوں گدھے پر جھپٹ پڑے اور اس کو مار ڈالا اور بولے "ایسے گناہ گار کا زندہ رہنا ٹھیک نہ تھا۔ آؤ ہم سب اس کو کھا کر ختم کر ڈالیں پھر کہیں جا کر بارش ہوگی۔"

اس کے بعد انہوں نے بے چارے گدھے کو کھا ڈالا۔ ●

اندھیر نگری

زہرہ جمال

کردار :

گرو

بھولا ـــــ چیلا

راجہ

مہامنتری

دکان دار

(پہلا منظر)

(ایک بازار ہے جہاں مٹھائی، پھل، سونا چاندی سب ٹکے سیر بک رہا ہے.)

حلوائی : آؤ بھائی . کھاؤ بھائی . ٹکے سیر برفی . ٹکے سیر کھاجا.

پھل فروش : ٹکے سیر سیب . ٹکے سیر انار

کھالو بھائی مت پڑو بیمار

صراف : ٹکے سیر سونا ٹکے سیر چاندی

آؤ بھائی سب کی ہے چاندی

سبزی فروش : ٹکے سیر بینگن ٹکے سیر ٹماٹر

ٹکے سیر آلو ٹکے سیر بھاجی

(گرو اور ان کا چیلا بازار میں آتے ہیں ،
چیلے کی آنکھیں حیرت سے پھٹ جاتی ہیں. وہ
گٹھری لے کر وہیں زمین پر بیٹھ جاتا ہے.)

چیلا : مہاراج یہی ست جگ ہے . یہ دنیا نہیں سورگ ہے
بیٹھ جائیے مہاراج . پیٹ پوجا کا سامان ٹکے سیر ـــ

گرو : بھولا، تو واقعی بھولا ہے . مورکھ ذرا وچار کر ٹکے
سیر ہر چیز کا بھاؤ جہاں ہوگا لوگ گدھا گھوڑا سب ایک ہی
لاٹھی سے ہانکا جاتا ہوگا . ایسی جگہ آرام کرنا خطرہ ہے

تمہیں صرف اس لئے گولی ماری جا رہی ہے تاکہ سپاہیوں کو گولیاں چلانے کی عادت رہے۔

خالی نہیں۔ چلو جلدی سے نکل جائیں۔ کہیں لالچ کے جال میں مکھی کی طرح پھنس کر نہ رہ جائیں۔

بھولا : مہاراج، لالچ کا کیا سوال ہے؟ جہاں سارے ہاتھ بڑھا کر جھولی بھر رہے ہیں۔ وہاں سے جانا گویا ایشور کی کرپا کو ٹھکرانا ہے۔

مہاراج : بھولا، یہ پریکشا ہے۔ یہ اندھیر نگری ہے۔ اندھیرے کے سوا یہاں کچھ نہ ملے گا۔ اچھی طرح سمجھ لے۔

بھولا : مہاراج۔ میں تو اب یہیں رہوں گا۔ آشیرواد دیجئے۔ کھاؤں گا، پیوں گا، موج کروں گا۔ میں تو جیتے جی ایسے سورگ کو چھوڑ کر نہ جاؤں گا۔ آپ بھی گھوم پھر کر یہیں آئیں گے۔ مہاراج اتنی بستیاں دیکھیں کہیں کا راجہ اتنا مہربان، اتنا دیالو اور سخی نہیں نظر آیا۔ اور کیا چاہئے انسان کو؟ پیٹ بھر بھوجن کے لئے ہی تو در در بھٹکتے ہیں۔ یہاں چار ٹکے دکشنا ملے گی اور راجہ کی طرح من چاہا بھوجن۔

گرو : اچھا بیٹا تو تو مورکھ نکلا اور لالچ کے جال میں پھنس چکا

بھگوان ہی تیری رکشا کریں۔ ہم تو چلتے ہیں۔ گرو کی یہ بات یاد رکھنا :

اندھیر نگری چوپٹ راجا
ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا

(گرو چلے جاتے ہیں۔ چیلا دکانوں پر جا کر خوب کھاتا پیتا ہے، خوش ہوتا ہے اور مزے سے سوجاتا ہے۔)

(دوسرا منظر)

(راجہ کا دربار۔ مہامنتری، دوسرے منتری اور درباری بیٹھے ہیں۔ فریادی پیش ہوتا ہے۔)

راجہ : فریادی ہمارے راج میں تم پر کس نے ظلم کیا ہے؟

فریادی : حضور، میرے مکان کی چھت دھڑام سے گر پڑی اور میرے اکلوتے بیٹے کی جان کا پنچھی پھر سے اڑ گیا۔ ہو، ہو، ہو (رونے لگتا ہے)۔

راجہ : مکان بنانے والے کو حاضر کیا جائے۔

سنتری : معمار حاضر ہے۔ (معمار کو پیش کرتے ہیں)

راجہ : ہم تمہارے بیٹے کو سزائے موت دیتے ہیں تاکہ تم کو معلوم ہو کہ اس غریب پر کیا گزری۔

معمار : مہاراج، دُہائی ہو ـــــ میرا قصور نہیں۔ قصور تو بہشتی کا ہے۔ اس نے گارے میں پانی زیادہ ملا دیا تھا۔

راجہ : کہاں ہے وہ نالائق بہشتی ـــــ حاضر کرو۔

(بہشتی کا بیٹا کھڑا ہوتا ہے۔)

بہشتی : سرکار ـــــ میں بے قصور ہوں۔

راجہ : تم نے گارے میں پانی زیادہ ملایا جس کی وجہ سے دیوار گر گئی، اور اس بدنصیب کا لڑکا مر گیا۔ ہم تمہارے لڑکے کو سزائے موت دیتے ہیں۔

بہشتی : حضور۔ . . میں . . . میرے کوئی

سوئیاں —— کھانے کے ساتھ ساتھ پہننے کے کام بھی آ سکتی ہیں۔

لڑکا نہیں میں تو کنوارا ہوں۔

راجہ : لڑکا نہیں تو پھر تم ہی کو پھانسی دی جائے گی چڑھا دو اسے پھانسی پر۔

بھشتی : رحم سرکار —— میری شادی ہونے والی ہے۔

راجہ : جلدی کرو۔ اسے پھانسی دو —— یہیں ہمارے سامنے۔

(جلاد پھندا لے کر آتا ہے، اور پھندا بھشتی کی گردن میں ڈالتا ہے۔ بھشتی گڑگڑا رہا ہے)۔

جلاد : سرکار پھندا بڑا ہے، گردن چھوٹی۔

راجہ : تو کسی موٹی گردن والے کو تلاش کر کے اُسے پھانسی دے دو۔

(جلاد کئی آدمیوں کو پکڑ کر پھندا اُن کی گردن میں ڈالتا ہے۔ مگر سب کی گردنیں چھوٹی ہیں۔ جلاد کی نظر چیلے پر پڑتی ہے جو گردن چھپائے ہوئے ہے۔ وہ بہت موٹا ہو گیا ہے۔)

جلاد : اِدھر آ، او موٹی گردن والے! کھا کھا کر بھینسا ہو رہا ہے۔

بھولا : نہیں، نہیں، مجھے چھوڑ دو۔ میں تو مسافر ہوں، پردیسی ہوں۔

راجہ : اس کی گردن بہت موٹی ہے۔ اسے آسانی سے پھانسی دی جا سکتی ہے۔ جلدی کرو۔ ہم جاتے ہیں (چلے جاتے ہیں)۔

بھولا : ہے بھگوان، میں گرو کا کہنا مانتا تو اس مصیبت میں نہ پھنستا —— ہائے گرو مہاراج۔ تم کہاں چلے گئے بھولا کو چھوڑ کر۔ یہ راکشش تو مجھے پھانسی پر چڑھا رہے ہیں۔

(گرو داخل ہوتا ہے۔)

گرو : بھولا شکایت نہ کر۔ بھگوان کے سچے بھگت، آج کا دن بڑا شبھ ہے۔ جسے پھانسی دی جائے گی سیدھا سورگ لوک میں جائے گا

بھولا : (گرو کے قدموں میں گر کر) مجھے بچائیے مہاراج۔ ابھی میں نے دنیا میں کیا دیکھا ہے۔ میری ہونے والی پتنی ودھوا ہو جائے گی۔ میرے سوامی مجھے بچائیے۔

گرو : اچھا تو ہم خود اس شبھ گھڑی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہمیں پھانسی دے دو۔ ہم بھگوان کے چرنوں میں سورگ پہنچ جائیں گے۔

مہامنتری : نہیں۔ اتنا مبارک موقع تمہیں کیسے دیا جا سکتا ہے۔ ہم مہامنتری ہیں۔ سورگ میں جانے کا حق ہمیں ہے۔

جلاد : مہاراج کے حکم کے بغیر میں کسی کو پھانسی نہیں دے سکتا او موٹے تازے موٹی گردن والے، جلدی آ۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔

مہامنتری : سنتری جاؤ، مہاراج کو بلاؤ

(سنتری جاتا ہے۔ راجہ آتے ہیں)۔

راجہ : کیا بات ہے؟

مہامنتری : یہ سوامی اِدھر آ نکلے اور اس مورکھ کے بدلے پھانسی پر چڑھنے کو تیار ہو گئے،

کیوں کہ آج جسے پھانسی ہوگی

سیدھا سورگ میں جائے گا۔ مہاراج، میں اس راج کا مہامنتری، آپ کا پرانا سیوک میں جانے کا زیادہ حق دار ہوں۔

راجہ : نہیں، ہرگز نہیں۔ ہم اس راج کے مالک ہیں۔ راجہ سے بڑا کسی کا حق نہیں۔ سورگ میں ہم جائیں گے تم سب سے پہلے —— لاؤ پھندا ہماری گردن میں ڈال دو۔

(جلاد پھانسی کا پھندا راجہ کی گردن میں ڈال دیتا ہے راجہ مر کر لٹک جاتے ہیں)

گرو : مہامنتری جی، آج تم سب کو ایک مورکھ راجہ سے نجات مل گئی اور یہ اندھیر نگری سورگ لوک بن گئی۔ اب تم کسی عقل مند کو راجہ بناؤ اور چین کی بنسی بجاؤ۔

مہامنتری : مہاراج آپ جیسا گیانی کہاں ملے گا۔

گرو : نہیں ہم تو سنیاسی ہیں۔ بھگوان کی نگری میں دوارے دوارے پھر کر لوگوں کو راستہ دکھانا ہمارا کام ہے اچھا ہم چلتے ہیں بھولا۔

بھولا : مہاراج کہاں جاتے ہیں؟ میں مرتے دم تک آپ کے پیچھے چلتا رہوں گا۔ آپ نے مجھے بچا لیا ورنہ اس مورکھ راجہ کی جگہ میری لاش لٹکی ہوتی۔

گرو : چلو بیٹا۔ لالچ کے جال سے تم آزاد ہو گئے ہو۔

بھولا : مہاراج سچ کہا ہے کسی نے: لالچ کا خانہ خراب۔ جلدی چلئے۔ کہیں دوسرا مورکھ گدی پر نہ بیٹھ جائے۔

گرو : چلو بیٹا۔

بھولا : (گاتا ہوا چلا جاتا ہے۔)

اندھیر نگری چوپٹ راجا
ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا

■ ■

تین جاسوس

سراج انور

چوتھی قسط

موٹا آدمی خود بھی گھبرا گیا اور اس نے اسٹرنگ وہیل کو جلدی سے کاٹا۔ اسٹیر اس چیز کو اپنے دائیں طرف چھوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ موٹے آدمی نے جس کا نام بعد میں وکرم نے چکرورتی لیا تھا۔ طنزیہ انداز میں وکرم کو دیکھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے مونہہ چھپا رکھا تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"تعجب ہے! تم جیسا بزدل آدمی آخر کس طرح ہمارے ساتھ رہ رہا ہے!" چکرورتی نے کہا۔

"کتا گیا ۔۔۔؟" وکرم نے مونہہ چھپائے چھپائے پوچھا

"بھلے مانس وہ کتا نہیں تھا ۔۔۔ ٹاٹ کی پھولی ہوئی بوری تھی۔"

"ٹاٹ کی بوری ۔۔۔" وکرم نے جلدی سے چہرے سے ہاتھ ہٹا لئے "شکر ہے بھگوان کا۔ میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔" چکرورتی چند لمحے تک اسے گھور کر دیکھتا رہا اور پھر

کسی بڑے معمار سے تم نے مکان بنوایا ہے شاید

غصّے بھرے لہجے میں بولا۔

"ہیروں کے چور کی بجائے، سچ کہتا ہوں تمہیں کسی سرکس میں جوکر ہونا چاہیے تھا۔"

"مذاق مت اڑاؤ چکرورتی۔" اس بار وکرم کو بھی غصّہ آگیا: "تم نے اس کتّے کو نہیں دیکھا ہے۔ گدھے کے برابر ہے سمجھے۔ یہ تو میرا ہی دل تھا کہ برداشت کر گیا ورنہ سچ کہتا ہوں کہ تم اگر اس کے پلّے پڑ جاؤ تو زندہ واپس نہ آؤ۔"

"تم تو یار ناراض ہو گئے۔" چکرورتی نے اسے غصّے میں دیکھ کر کہا۔ "چلو غصّہ تھوک دو اور اب یہ سوچو کہ باس کو کیا جواب دو گے؟"

"جواب کس بات کا ——؟"

"ہیروں کے کھو جانے ——۔"

"تم بھی بڑے احمق ہو۔" وکرم نے ہنس کر جواب دیا: "چلو اب تمہیں بتا ہی دوں کہ میں نے ہیروں کو پانی میں پھینکنے کے بعد سیڑھیوں سے آگے بڑھ کر دیوار پر ایک نشان لگا دیا ہے۔ اس نشان کی سیدھ میں اگر ہم پانی کی طرف جائیں تو تقریباً کنارے سے ایک میٹر آگے وہ ہیرے تہہ میں پڑے ہوئے مل جائیں گے اب بولو کیا کہتے ہو؟"

"کمال ہے یار۔" چکرورتی نے قائل ہوتے ہوئے جواب دیا۔ "اب تو میں بھی مان گیا۔"

"بس تو اب تم اسٹیمر کو واپس اسی طرف لے چلو ——" وکرم نے کہا۔

"کیوں ——؟"

"شام ہو چکی ہے۔ ہم رات کا انتظار کریں گے اور رات ہوتے ہی کنارے پر پہنچ جائیں گے۔ میں نے اب اپنا پروگرام تبدیل کر دیا ہے۔"

"پروگرام تبدیل کر دیا ہے! یعنی؟" چکرورتی نے پوچھا۔

"ہم ہیرے رات ہی کو نکال لیں گے باس کو ہیرے دینے کے بعد اس سے اپنا حصّہ وصول کر لیں گے۔"

"یہ بات تو بہت عمدہ ہے۔ چلو نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔" چکرورتی نے اتنا کہہ کر اسٹیمر کا رُخ موڑ دیا۔

انجم اور **ثروت** بڑی دیر سے لہری کو ڈھونڈتے ہوئے پھر رہے تھے۔ اور بے چارہ لہری بار بار زمین کو سونگھتا ہوا آہستہ آہستہ پُل کی سمت بڑھتا جا رہا تھا۔ وکرم کی بو ابھی تک اس کے نتھنوں میں بسی ہوئی تھی۔ اسے دراصل اسی بات کی تربیت دی گئی تھی۔ مجرم خواہ کتنی ہی دور کیوں نہ ہو۔ لہری کو اگر اس کے کپڑے سنگھا دیے جاتے تو پھر وہ اسے پاتال میں بھی ڈھونڈ لیتا تھا۔

انجم اور ثروت کو معلوم ہی نہ تھا کہ لہری کس جگہ موجود ہے ثروت بے چینی سے بار بار سڑک کو دیکھ رہی تھی۔

"نہ جانے کدھر مر گیا یہ کتّے کا بچّہ؟" انجم نے دانت پیستے ہوئے کہا

"وہ بالکل تمہاری ہی طرح ہے جمی بھیا. جس طرح تم جس چیز کے پیچھے پڑ جاتے ہو اور اسے کر کے ہی چھوڑتے ہو اسی طرح یہ لہری ہے. یقیناً وہ اس آدمی کے پیچھے گیا ہے تو اب اسے پکڑ کر ہی واپس آئے گا . . . ؛"

"دیکھو ثروت ـــ تم نے پھر مجھے کُتا کہا ہے ؟" انجم چلتے چلتے رک گیا.

"نہیں تو ـــ" ثروت نے بھولپن سے کہا.

"تم نے کہا ہے نا کہ لہری بالکل میری طرح ہے !"

"تم تو پھر برا مان گئے جمی بھیا. چلو میں یوں کہہ دیتی ہوں کہ تم بالکل لہری کی طرح ہو ــ بس ؟"

"پھر وہی بات." انجم نے غصہ دکھاتے ہوئے کہا. "گھونسا ماروں گا ثروت"

"لو بھئی حد ہو گئی ــ تم تو ہر بات کا برا مان رہے ہو. ابھی کہا تھا کہ لڑنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے اور خود ہی لڑنے بھڑنے پر آمادہ نظر آتے ہو" ثروت نے پہلی بات یاد دلاتے ہوئے کہا.

"ہاں کہا تو تھا مگر تم بار بار الٹی سیدھی ہانک رہی ہو"

انجم سوچنے لگا " اچھا خیر چھوڑو اس گڑبڑ گھٹالے کو ــ اور یہ سوچو کہ وہ کلّن کا بھائی کہاں گیا ہے ؟"

ثروت سوچنے لگی. وہ دونوں پھر واپس اسی پُل پر آ گئے تھے جہاں کچھ دیر پہلے وہ حادثہ پیش آیا تھا. ثروت دیوار سے لگی ہوئی لگاتار سوچے جا رہی تھی. پُل کی دیوار کے کچھ ہی دور چند سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو نیچے اترنے کے لئے تھیں. پُل پر چلتا ہوا آدمی اگر دریا کے کنارے جانا چاہے تو ان سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اتر سکتا تھا. ثروت دیوار کی طرف مونہہ کئے کھڑی تھی. یہ دیوار پل کے دونوں طرف بنی ہوئی تھی اور مشکل سے ایک گز اونچی تھی. ایک قسم کی منڈیر کہہ لیجئے اس کو. ثروت اس منڈیر پر سینے کے

دروازے کی گھنٹی خراب ہے تو تاشی کی آواز تو اندر چلی جائے گی.

بل جھک گئی اور دریا کو دیکھنے لگی. اچانک اس کی نظر نیچے پڑی ــ دریا کی سطح سے جو دیوار اوپر اٹھی تھی اور ثروت کے سینے تک آتی تھی. اس دیوار پر چاک سے کراس (X) کا ایک نشان بنا ہوا تھا. ثروت کا ماتھا ٹھنکا. کیوں کہ یہ نشان تازہ تازہ بنایا ہوا معلوم ہوتا تھا.

"جمی بھیا جلدی یہاں آؤ ــ دیکھو یہ کیا ہے ؟ ـــــ" ثروت چیخی.

"کیا ہے ؟" انجم نے بیزاری سے کہا.

"یہاں آکر دیکھو یہ نشان کیسا ہے ؟"

نشان کا سن کر انجم جلدی سے ثروت کے قریب آیا اور اس نے بھی نیچے جھانک کر دیوار کو دیکھا. ہر چند کہ شام ہو چکی تھی اور سورج ڈوب چکا تھا. مگر وہ نشان اب بھی صاف نظر آ رہا تھا.

"کچھ سمجھے بھیا ــ ؟" ثروت نے پوچھا.

"کیا ــــ ؟"

"یہ نشان اس لئے لگایا گیا ہے کہ شاید چوروں نے کوئی خاص چیز اس نشان کے آس پاس چھپائی ہے. اگر ہم دونوں یہاں

کچھ دیر تک چھپے رہیں تو شاید پتہ چل جاتے۔ وہ آدمی اس پل پر ٹہلتا ہوا ملا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ لہری سے بچ کر وہ ضرور یہاں واپس آئے گا۔ اس وقت شاید کچھ بھید کھلے۔

انجم اور ثروت کافی دیر تک وہاں چھپے بیٹھے رہے مگر نہ تو لہری ہی آیا اور نہ ہی وہ شخص جس کی آستین لہری نے پکڑی تھی۔ رات کے گیارہ بج گئے۔ اُن دونوں کو بھوک لگ رہی تھی۔ مگر مجبور تھے کہ گھر واپس نہیں جا سکتے تھے۔ کیوں کہ جس کام کا بیڑہ انہوں نے اٹھایا تھا۔ اب اسے ادھورا چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں صبح کے نکلے ہوتے تھے۔ اور اب بج رہے تھے رات کے گیارہ۔ امی اور ابا سخت پریشان تھے اور کلن بے چارہ پورے شہر کو چھان چکا تھا۔ پولیس بھی حرکت میں آ گئی تھی۔ کیوں کہ دو نڈر اور بہادر بچے پولیس کے کتے لہری کے ساتھ غائب ہو چکے تھے۔

کلن نے ہزاروں مرتبہ بازاروں کا چکر لگایا تھا۔ بار بار ریڈیو سنا تھا مگر طبلے کی آواز پر بالکل نہیں رکا اور نہ ہی جھوما۔ اس کی جان پر بن رہی تھی۔ دونوں شریر بچوں پر وہ جان چھڑکتا تھا۔ مانا کہ وہ اسے پریشان کرتے تھے۔ مگر اس کا خیال بھی تو کرتے تھے!

انجم سوچ ہی رہا تھا کہ دریا کے کنارے سے اٹھ کر اب سیڑھیوں کے ذریعے اوپر چلے۔ اسے خود احساس تھا کہ گھر میں سب پریشان ہوں گے۔ لہٰذا اب جلد سے جلد گھر واپس چلنا چاہیے۔ اس نے ثروت سے یہ بات کہی ہی تھی کہ اچانک ایک عجیب آواز سنائی دی۔

"یہ کیسی آواز ہے ثرو؟"

"کسی جہاز کی آواز معلوم ہوتی ہے جمی بھیا۔" ثروت نے کان پر ہاتھ لگا کر سننے کی کوشش کی۔ "کہیں ہمیں تو نہیں ڈھونڈا جا رہا؟"

"ہو سکتا ہے ـــ ہمیں دیر بھی تو بہت ہو گئی ہے۔۔۔" ثروت نے جواب دیا۔

"وہ دیکھو سامنے دریا میں ـــ وہ دو آنکھیں کیسی چمک رہی ہیں؟"

ثروت نے اس طرف دیکھا تو سچ مچ وہ ڈر گئی، کیوں کہ دو آنکھیں سی انہیں گھور رہی تھیں اور آہستہ آہستہ بڑی ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی گھر گھر کی آواز بھی اسی طرف سے آ رہی تھی۔

"ثروت جلدی سے کسی جگہ چھپنے کی کوشش کرو۔" انجم نے اسے بازو سے پکڑ کر دھکیلتے ہوئے کہا۔

"کیوں ـــ؟" ثروت گھبرا گئی۔

"اری بے وقوف! یہ کوئی اسٹیمر معلوم ہوتا ہے اور ہماری ہی طرف آ رہا ہے۔"

درحقیقت وہ کوئی اسٹیمر ہی تھا اور جس وقت وہ کنارے سے آ کر لگا ہے۔ انجم اور ثروت وہاں سے کھسک چکے تھے اور اب سیڑھیوں کے نیچے بنے ہوئے خلا میں چھپے کھڑے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اسٹیمر پر سے وہی آدمی کود کر اترا جس کی آستین لہری نے پکڑ لی تھی اور پھر وہ دیوار کو دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے وکرم ـــ؟" چکرورتی نے اسٹیمر کے اندر سے پوچھا۔

"نشان نظر نہیں آ رہا ـــ سرچ لائٹ جلاؤ۔"

وکرم نے چلا کر کہا اور اس کے کہنے پر چکرورتی نے سرچ لائٹ جلا دی جو دائرے کی شکل میں دیوار پر پڑنے لگی۔ جلد ہی روشنی اس جگہ پڑی جہاں وکرم نے اس کا نشان لگایا تھا۔

"بس ٹھیک ہے۔" وکرم نے کہا۔ "تم وہیں رہو میں پانی میں غوطہ لگا کر پلاسٹک کا تھیلا نکالتا ہوں۔" بچوں کے دیکھتے دیکھتے وکرم نے دریا میں غوطہ لگایا اور چند منٹ کے اندر اندر تھیلا دریا

کی تہہ میں سے نکال کر باہر آگیا۔"

"یہ دیکھو۔ اب تو تمہیں یقین آگیا۔ یہ رہے ہیرے۔"

وکرم نے خوشی اور جوش کے ساتھ ہیروں کو اپنی ہتھیلی پر نکال کر دکھایا۔

"معاف کرنا۔ میں نے تم پر خواہ مخواہ شبہ کیا تھا۔"

چکرورتی نے جواب دیا۔

انجم نے سرچ لائٹ کی روشنی میں چمکتے ہوتے ہیروں کو دیکھا تو اچانک جوش میں بھر گیا۔

"دیکھا ـــ دیکھا تم نے ثروت ـــ وہ کم بخت ہیرے نکال کر دکھا رہا ہے۔"

"جی بھیا یہ تو بہت سارے ہیں۔"

"ہاں ـــ اور یہ لوگ ان ہیروں کو لیجانا چاہتے ہیں۔؟"

انجم نے اتنا جوش بھرا ہوا تھا کہ احتیاط کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس نے اچانک چلّا کر کہا۔

"تم ان ہیروں کو لے کر یہاں سے نہیں بھاگ سکتے۔"

وکرم نے گھبرا کر آواز کی سمت میں دیکھا۔ انجم اسے اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ ثروت اسے روک رہی تھی۔

"کون ہے ـــ؟" وکرم نے اندھیرے میں گھورتے ہوتے پوچھا۔

"یہ میں ہوں ـــ" انجم نے بہادری دکھانے کی کوشش کی ـــ

"ارے ـــ تم تو وہی ہو جس کے پاس وہ خوف ناک کتّا ہے۔" وکرم نے ہیروں کو جلدی سے پلاسٹک کی تھیلی میں واپس ڈالتے ہوئے کہا "چکرورتی ـــ پکڑلو اسے۔"

چکرورتی نے آگے بڑھ کر انجم کی کلائی پکڑلی۔ اس نے چھڑانے کی بہتری کوشش کی مگر ایک بدمعاش کے مقابلے میں بھلا چھوٹے سے لڑکے کی طاقت کیا کام کرسکتی تھی؟

ٹھنڈ کی وجہ سے ٹونی کے الفاظ جم رہے ہیں اب گھر جاکر گرم کروں تو پتہ چلے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

ثروت نے بھائی کو یوں آسانی سے بدمعاشوں کے چنگل میں پھنستے دیکھا تو وہ بھی احتیاط کو بھول کر بھاگتی ہوئی آئی اور اس سے پہلے چکرورتی کچھ سمجھ سکتا اس نے آگے بڑھ کر چکرورتی کے ہاتھ پر کاٹ کھایا۔

"اُف ـــ کُتیا!" چکرورتی نے اپنے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے کہا "ٹھیر جا تیری خبر لیتا ہوں۔"

ثروت نے بھاگنے کی سوچی ہی تھی کہ چکرورتی نے انجم کو چھوڑ کر ثروت کو پکڑ لیا ـــ انجم نے اسے چھڑانے کی کوشش کی ہی تھی کہ وکرم نے دوڑ کر اسے بھی پکڑ لیا ـــ اب دونوں بچے بے بس چوہوں کی طرح بدمعاشوں کے پھندے میں پھنس چکے تھے۔

پھر کیا ہوا ـــ؟ کیا ہیرے بدمعاش لے گئے
انہوں نے ثروت اور انجم کے ساتھ کیا سلوک
کیا ـــ؟ یہ مارچ کے کھلونا کی آخری قسط میں پڑھئے۔

●●

ابّا کی نقل

ننھے میاں ہمیشہ اپنے ابا کو آئینہ کے سامنے مونہہ پر صابن لگاتا دیکھتے تھے۔ ایک دن . . .

▲ ابا کے دفتر جاتے ہی ننھے میاں نے اُن کا سارا سامان زمین پر پھر سے سجایا

برش میں صابن لگا کر پانی میں گیلا کیا ▲

▲ صابن مونہہ پر لگا کر ریزر لگایا اور سارا صابن اس سے صاف کیا

◀ اس کے بعد تولیے سے چہرہ صاف کیا۔ ننھے میاں نے سوچا لو میں بھی ڈیڈی بن گیا: شکر ہے ریزر میں بلیڈ نہیں تھا ورنہ ڈیڈی بننے کا یہ مذاق ساری زندگی یاد رہتا

تصاویر: [illegible] ■■

کام کرنے والے: جمیل، فضل، نعیم، ناصر
راشد، سائرہ، فرحت
اور مزاج
ہدایات: الیاس دہلوی
تصویریں: سراج انور

دوڑ

▲ قلعے کے لاہوری دروازے کے قریب کچھ مکانات تھے جن میں سے ایک مکان میں مزاج صاحب رہتے تھے۔ جمیل کو دوڑ کی شرط لگانے کا بہت شوق تھا۔ ایک دن یہ دوڑ کی شرط لگی

مزاج صاحب نے کہا کہ قلعے کے دوسرے دروازے یعنی دلی دروازے تک بچے جائیں اور وہاں کے جنرل اسٹور سے صابن تیل اور دوسری چیزیں ایک تھیلے میں لائیں گا۔ جیت ہو کر وہ وہاں تک گئے تھے۔ انعام میں کیا دیا جائے یہ سوچیں گے ——— فی الحال تو لائن میں کھڑے ہو جاؤ۔

▼ اور ایک دو ——— تین ———
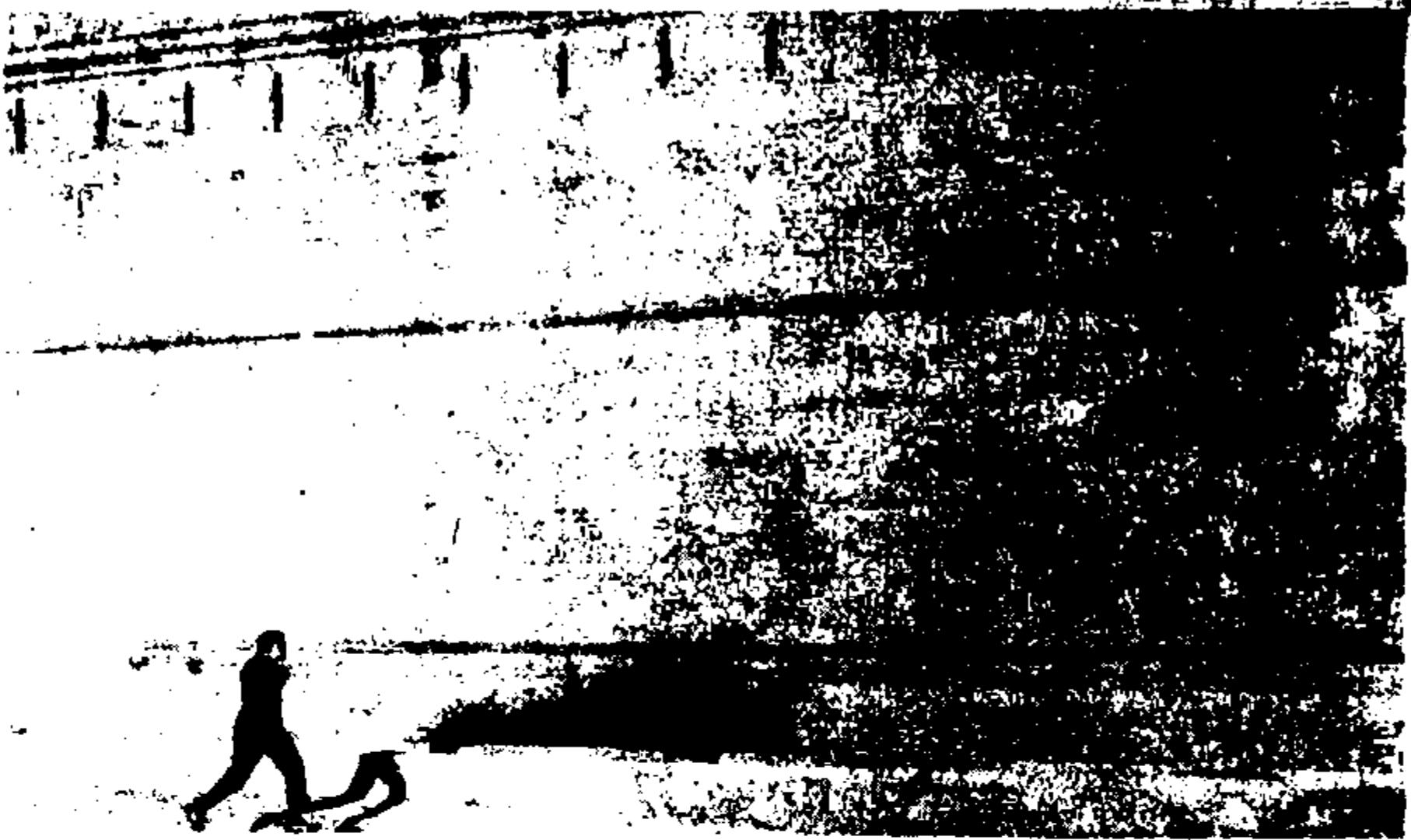
▲ سب بچے بین سنتے ہی دوڑ پڑے۔ چھوٹے بچے تو جلدی ہی چیں بول گئے۔ ذرا بڑے کچھ دُور تک بھاگے اور تھک کر بیٹھ گئے مگر جمیل بھاگتا رہا۔

دلی دروازے کے جنرل اسٹور تک وہ بھاگتا ہوا گیا۔ مزاج صاحب نے جو پیسے بھاگنے سے پہلے دئے تھے۔ اُن سے سامان خرید کر ایک تھیلے میں رکھ اور پھر واپسی کے لئے دوڑ پڑا۔ تھیلا ہاتھ میں تھا اور وہ جلد سے جلد گھر تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ▼

▲ سب بچے چونکہ ہار چکے تھے۔ لہذا وہ تو اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ البتہ مزاج صاحب دروازے پر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ جمیل نے اُنہیں سامان دیا اور انعام مانگا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے وعدہ کیا تھا کہ سوچوں گا۔ مگر ابھی تک کچھ سوچا ہی نہیں۔

◀ جمیل کی خوشی خاک میں مل گئی۔ آسے بھلا کیا معلوم تھا کہ مزاج صاحب نے جمیل کو بے وقوف بنایا ہے۔ اور صبح ہی صبح جس سامان کی انہیں ضرورت تھی انہوں نے ایک چھوٹا سا ڈرامہ کھیل کر جمیل کے ذریعے دو منٹ میں منگوا لیا تھا۔ ■ ■
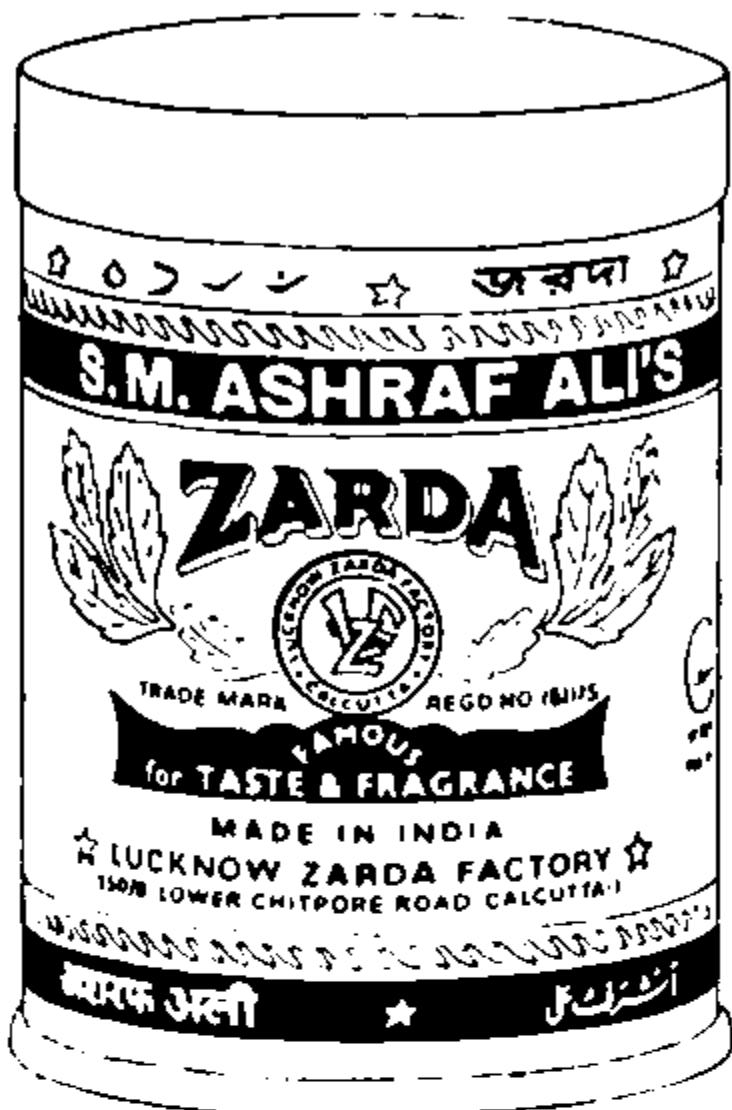
پان میں کھانے کے لئے

ایس ایم اشرف علی کا

زردہ

سب سے زیادہ کفایتی

ہندستان کا سب سے کڑا زردہ

عمدہ خوشبو اور کافی کڑا

ایس ایم اشرف علی کا

اسپیشل گلابی

قوام
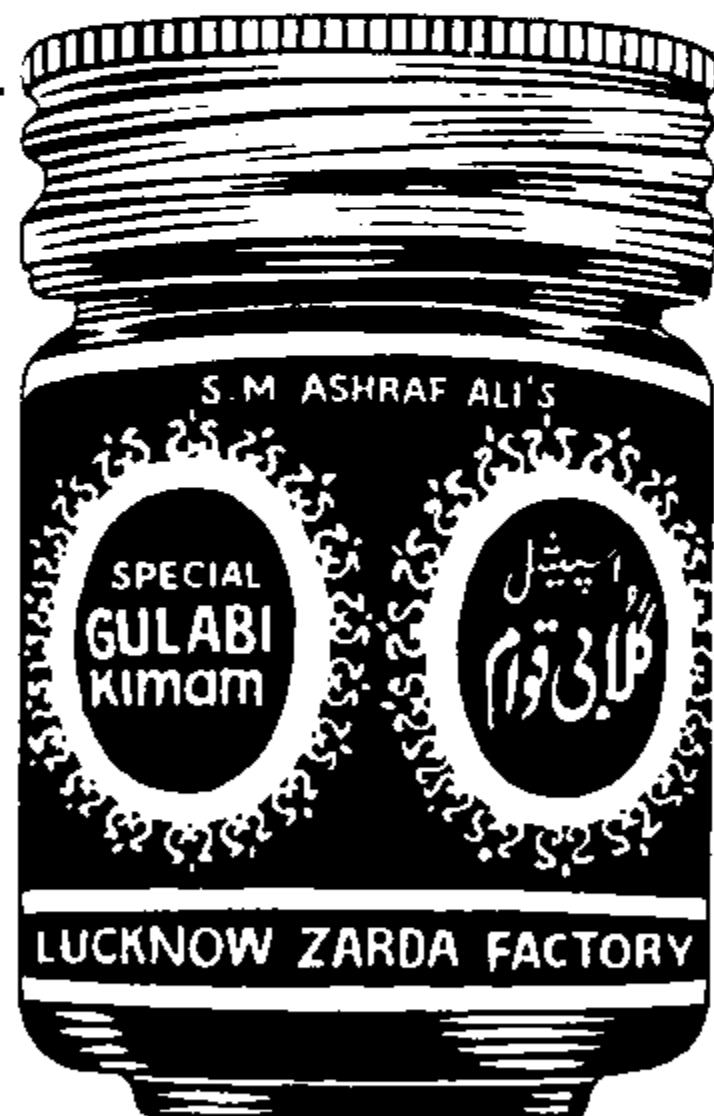
لکھنؤ زردہ فیکٹری

۲۹ رابندرا سرانی، کلکتہ ۷۳ فون: ۳۴-۲۷۹۵ اور ۳۴-۴۰۱۳

▲ فوٹو گرافر کی دوکان پر ایک دن ایک بے وقوف لڑکا پہنچا اور ایک لفافہ جیب سے نکال کر فوٹو گرافر صاحب کی طرف بڑھایا

فرمایئے کیا کام ہے؟ ◀
فوٹو گرافر نے
بڑی محبت سے پوچھا

کام کرنے والے:
سریندر کمار اور پپّو

ہدایات: الیاس دہلوی

تصویریں: سراج انور

▲ "دیکھئے بات یہ ہے کہ یہ ایک تصویر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس میں میرے دادا جو ٹوپی پہنے ہوئے ہیں وہ سر سے اتر جائے اور آپ انہیں آج کے لوگوں جیسا جینٹل مین بنا دیں۔" لڑکے نے کہا

▶ "میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے" فوٹو گرافر صاحب بولے۔ "آپ کہیں تو ناک کی جگہ کان اور مونھ کی جگہ آنکھ لگا دوں"

"لیکن میں چاہتا ہوں کہ ٹوپی
اتارنے کے بعد آپ انگریزی
بال بنا دیں" لڑکے نے کہا۔
"ضرور بن جائیں گے" فوٹوگرافر
صاحب نے پوچھا "لیکن
یہ تو بتایئے کہ آپ کے دادا
مانگ کس طرف نکالتے تھے۔
دائیں طرف یا بائیں طرف؟"
"کمال ہے
آپ مجھ سے پوچھ رہے
ہیں۔ ارے صاحب
جب آپ ٹوپی
اُتاریں گے تو خود ہی
دیکھ لیجئے گا"
بے وقوف سا لڑکا یہ کہہ کر چلتا بنا
لیکن فوٹوگرافر صاحب
سوچتے رہ گئے کہ ان دونوں میں سے
پاگل کون ہے؟

جو ملیں چلاتا ہے وہ بھی اپنا بھائی ہے   دولتیں کماتا ہے وہ بھی اپنا بھائی ہے
خوب عیش اُڑاتا ہے وہ بھی اپنا بھائی ہے   دعوتیں کھلاتا ہے وہ بھی اپنا بھائی ہے
دس کے سو بناتا ہے وہ بھی اپنا بھائی ہے

وہ بھی ہے جو کہنے کو یوں تو کاروباری ہے   شاید اُس کی قسمت میں ذِلّت اور خواری ہے
نشہ باز ہے یا پھر پیشہ ور جُواری ہے   ساری زندگی اس نے ایسے ہی گزاری ہے
لُٹتا ہے لُٹاتا ہے وہ بھی اپنا بھائی ہے

ایک وہ بھی ہے جو ہے کارخانے میں نوکر   کام کرتا رہتا ہے خالی پیٹ دِن دِن بھر
ہائے کیا گزرتی ہے اُس کے بال بچّوں پر   عُمر گزاری ہے اُس نے جانے کِس بھروسے پر
غم اُٹھائے جاتا ہے وہ بھی اپنا بھائی ہے

ایک وہ بھی ہے جس کی زندگی تو ہے سادی   لیکن ایسی ہے جس میں عیش ہے نہ آزادی
ایک نقش ہے جس کو کہیے نقشِ بربادی   آپ اُس کو دیکھیں گے جب کبھی ہو کہیں شادی
ناچتا ہے گاتا ہے وہ بھی اپنا بھائی ہے

وہ بھی ہے جو وقت اپنا اس طرح گنواتا ہے   روز پیٹ کی خاطر ہر گلی میں جاتا ہے
جاں گداز لہجے میں حالِ دِل سُناتا ہے   ایک میلا سا جھولا بھر کے گھر کو لاتا ہے
مانگ کر جو کھاتا ہے وہ بھی اپنا بھائی ہے

اِک غریب ہے جس کو سب سمجھتے ہیں خوش حال   عِلم اُس کی دَولت ہے اور کتابیں اُس کا مال
چاہے کوئی موسم ہو ایک سی ہے اُس کی چال   یہ کمال ہے اُس کا اپنے درجے میں ہر سال
سب سے اوّل آتا ہے وہ بھی اپنا بھائی ہے

وہ بھی ہے جو ہے بالکل زندگی سے بے پروا   کوئی بھی نہیں جس کو کام دین و دُنیا کا
پڑھنے لکھنے کا دِن بھر نام تک نہیں لیتا   یا تو پھرتا رہتا ہے ننگے پیر آوارہ
یا پتنگ اُڑاتا ہے وہ بھی اپنا بھائی ہے

ہنستی لکیریں
ا۔۔ا۔۔آ۔۔۔چھیں
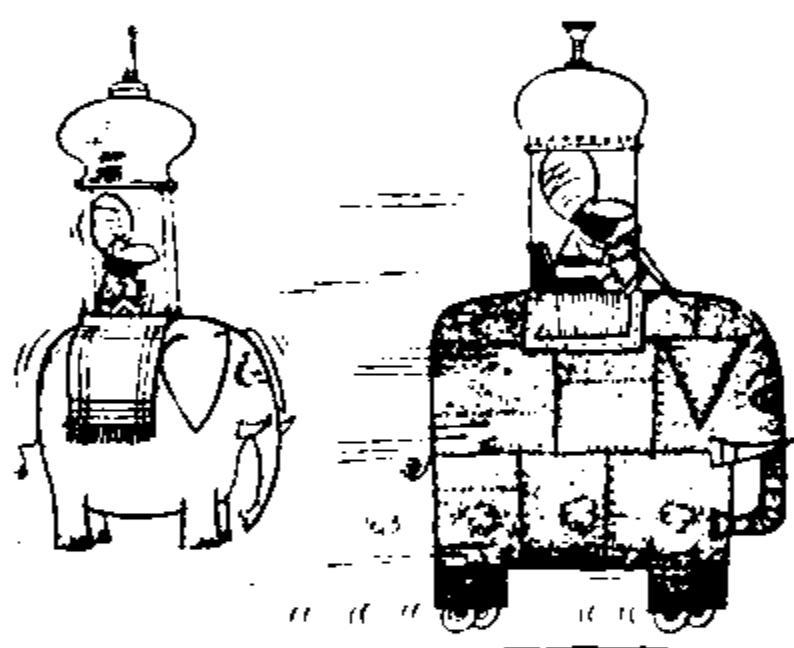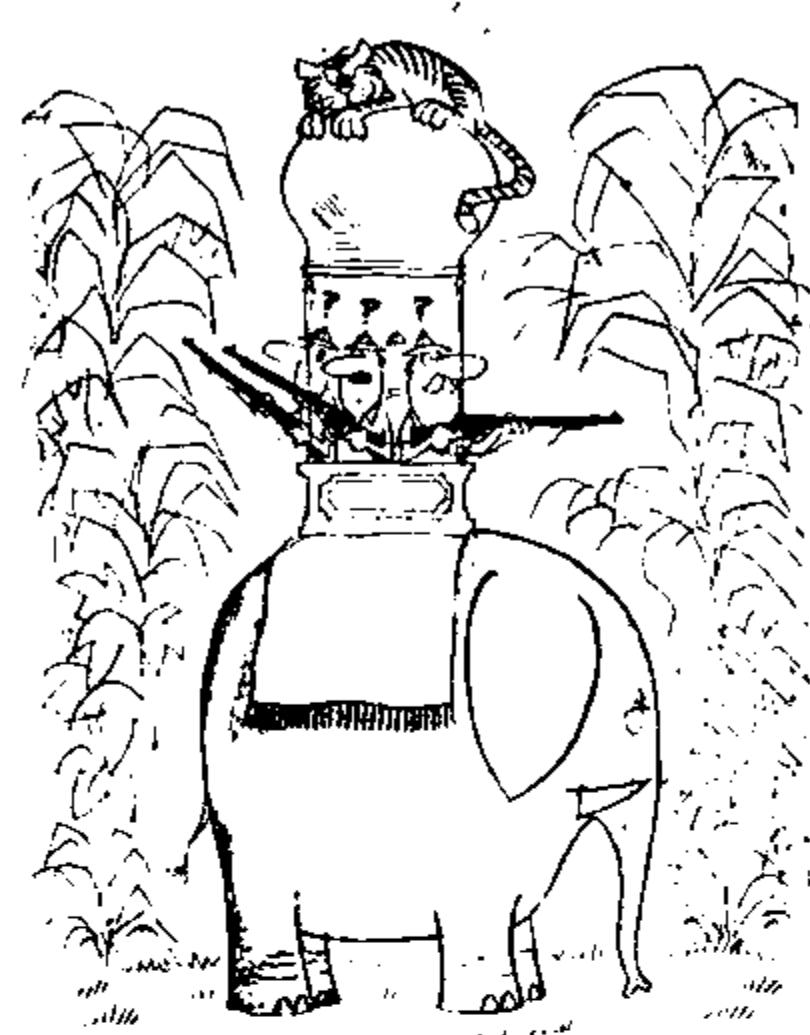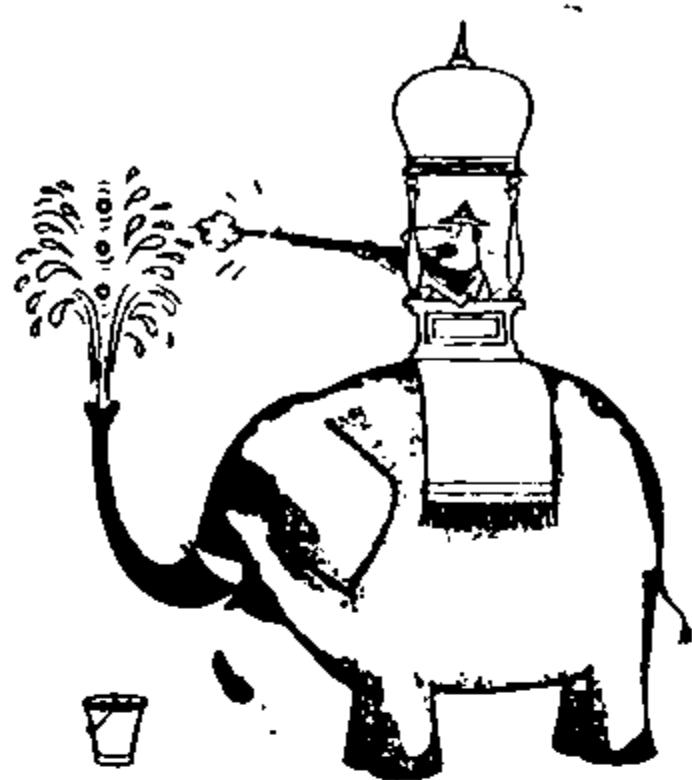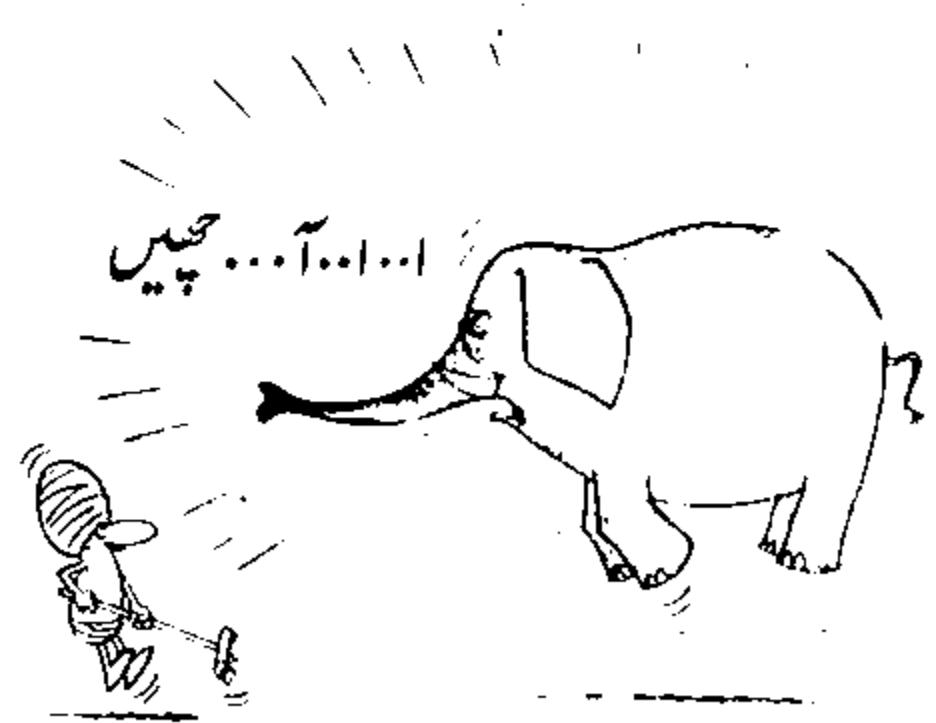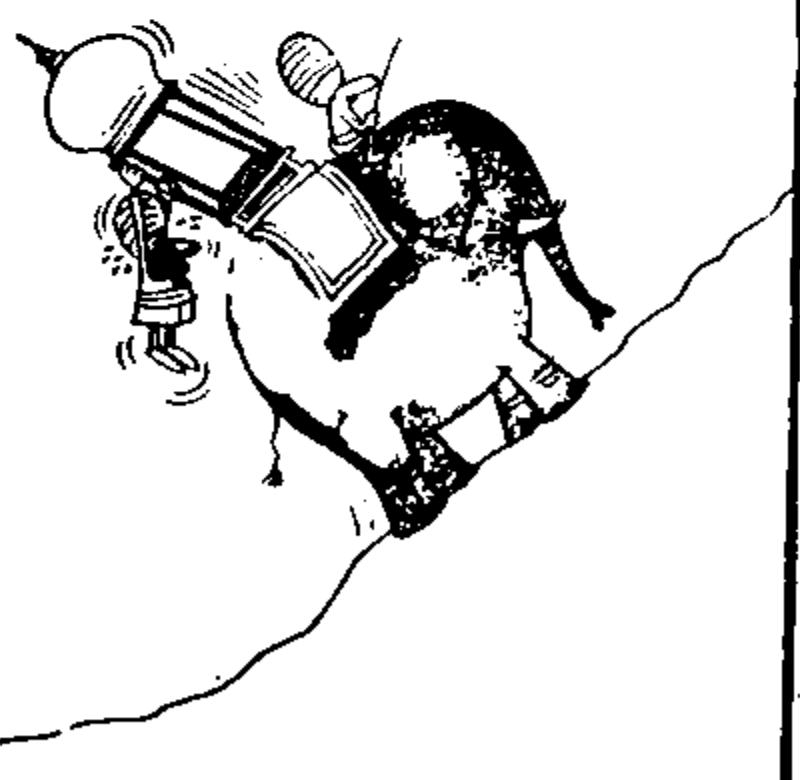
اس تصویر کا کچھ حصہ ہم نے غائب
کر دیا ہے۔ تم غور سے دیکھو اور بتاؤ
کہ یہ کون سا جانور ہے؟
اپنا جواب ایک پوسٹ کارڈ
پر لکھ کر نیچے لکھے ہوئے پتے پر
بھیج دو۔ صحیح جواب بھیجنے والوں میں سے دس بہن بھائیوں کو
دو دو روپے کی کتابیں انعام دی جائیں گی۔

تصویری پہیلی نمبر ۴۸، ماہ نامہ کھلونا، آصف علی روڈ نئی دہلی

ہمیں جواب ملنے کی آخری تاریخ: ۱۵۔ جنوری ۱۹۷۲

قصہ پیاس بجھانے کا

کوثر چاند پوری

مئی کا مہینہ آدھا گزر چکا تھا۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ دن بھر لُو کے جھکڑ چلتے رہتے تھے۔ امجد کے اسکول میں چُھٹی تھی۔ وہ صبح سے شام تک اپنے وفادار کُتّے ہٹلر کو ساتھ لئے غلیل سے چڑیوں کا شکار کھیلتا پھرتا۔

ایک روز امجد ایک بڑے جنگل میں گھوم رہا تھا، چاروں طرف بگولے ناچ رہے تھے۔ ہٹلر پیاس سے بے تاب تھا۔ اس کی زبان مونہہ سے باہر آگئی تھی۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا خطرناک درندوں سے امجد کو بچانے میں اُس نے بڑی دوڑ دھوپ کی تھی ہر وقت بھونکتا ہی رہتا تھا۔ بھیڑیوں اور چیتوں کو اُس نے امجد کے پاس تک پھٹکنے نہ دیا تھا۔ اسی محنت کا نتیجہ تھا کہ اُسے سخت پیاس لگنے لگی تھی۔

تپتی ہوئی گرم ریت پر چلنے سے پاؤں جلنے لگے تھے۔ امجد برگد کے درخت کی چھاؤں میں ذرا دیر کو رُک گیا۔ اُس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑا کر دیکھا۔ کہیں پانی نظر نہ آیا۔ دُور پہاڑی کی وادی میں بہت سے ہرن چرنے میں مشغول تھے۔ کچھ چرواہے اپنی بھیڑ بکریوں کو اُسی طرف لئے جا رہے تھے۔

امجد نے سمجھ لیا کہ ضرور وادی میں کوئی جھرنا، تالاب یا ندی ہے۔ بھیڑیں پانی پینے وہیں جا رہی ہیں۔ ہرن بھی پیاس بجھانے کا موقع ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ پانی کہاں مل سکتا ہے۔ اُس نے ہٹلر کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "گھبراؤ نہیں، میرے پیارے ہٹلر۔ میں جلدی تمہیں ایسی جگہ لے چلوں گا جہاں ٹھنڈا پانی پی کر تم اپنی پیاس بجھا سکو گے۔ آؤ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔"

امجد نے تیزی سے وادی کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ ہٹلر کان کھڑے کئے اور دُم نیچے گرائے اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ میل سوا میل چلنے کے بعد بہت سے ہرے بھرے درخت دکھائی دینے لگے۔ امجد نے ہٹلر کی پیٹھ ٹھونک کہا "ارے، وہ رہا جھرنا!" یہ کہہ کر وہ جھرنے کی سمت چلا۔ جھرنے کی پتلی سی دھار میں موتی جیسا شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ دھار ایک گہرے گڑھے میں گر رہی تھی جس میں بہت سا پانی بھرا ہوا تھا۔

"ہٹلر آؤ، میں تمہیں پانی پلاؤں۔ جلدی آؤ میرے ساتھ۔ پیاس مجھے بھی لگی ہے۔ میرے ہونٹ بالکل سوکھ گئے ہیں۔ لیکن میں پہلے تمہیں پانی پلاؤں گا پھر خود پیوں گا۔ تم نے مجھے بچانے کی بڑی کوشش کی ہے۔ میں تمہارا احسان مند ہوں۔"

دونوں دوڑتے ہوئے چلے۔ گڑھے کے پاس پہنچ کر امجد نے دیکھا کہ پانی کناروں سے بہت نیچے چلا گیا ہے۔ اُس

کا ہاتھ کسی طرح وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ امجد بہت حیران ہوا۔ اُسے محلّے کا وہ دُوکان دار یاد آگیا جو اناج کی ہزاروں بوریاں کوٹھوں میں بھر لیا کرتا تھا۔ امجد نے ذرا جُھک کر دیکھا تو پانی اور تہہ میں چلا گیا۔ امجد نے زور سے کہا "شاید تمہارا مطلب ہے کہ میں اپنی اور ٹشلر کی پیاس نہ بُجھاؤں۔ تم دو گلاس پانی بھی مجھے نہیں دے سکتے؟"

گڑھے میں بہت سی لہریں اُٹھیں اور کناروں سے ٹکرا کر لَوٹ گئیں۔ اُن کا مطلب بالکل صاف تھا یعنی لہریں کہہ رہی تھیں کہ گڑھا کسی کی پیاس نہیں بجھایا کرتا۔ یہ ایک بُوند بھی کسی کے حلق میں نہیں ٹپکاتا۔ جھرنے سے پانی لینا اور اپنے پیٹ میں بھر لینا ہی اس کی عادت ہے۔ اس کو سدا یہی ڈر لگا رہتا ہے کہ شاید اگلے سال بارش نہ ہو اور اِس

جس حساب سے آپ کے بچے کا وزن بڑھ رہا ہے
دس سال میں اُس کا وزن چار من ہو جائے گا

طرح اُس کا برسوں کا اکٹھا کیا ہوا پانی ختم ہو جاتا۔

"یہ بات ہے!" امجد نے غصّے کے ساتھ کہا "گڑھا پانی جمع کر رہا ہے۔ وہ دوسروں کو تکلیف دے کر اپنا پیٹ بھرنے کی فکر میں ہے۔ ہٹلر، ڈرو نہیں۔ میں تمہیں کسی اور جھرنے پر لئے چلتا ہوں۔ میں تمہیں پانی پلاکر ہی دم لوں گا۔"

دونوں پھر چلنے لگے۔ اس مرتبہ انہیں بڑا فاصلہ طے کرنا پڑا۔ کافی چلنے کے بعد انہیں پھر ایک جھرنا نظر آیا۔ اس کی دھار دھیمی رفتار سے بہہ رہی تھی۔ پانی ناچتا، اُبل کھاتا، بُلبلے بناتا آگے کو جا رہا تھا۔ راستے میں ایک گہرا گڑھا تھا۔ اس میں بہت سا پانی بھرا ہوا تھا لیکن اُس نے پیٹ بھرنے کے بعد

جھرنے کا راستہ نہیں روکا تھا۔ پانی گڑھے سے گزر کر اور آگے کو بہتا جا رہا تھا۔ امجد نے اس کے قریب پہنچ کر کہا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ دوسروں کا حق مار کر آئندہ سال کے لئے ذخیرہ جمع نہیں کر رہے ہیں، اور سب کو پانی پلا کر دریا دِلی کا ثبوت دیتے ہیں۔"

آواز ہوا میں گونجی اور پانی میں ہلچل مچ گئی۔ لہروں کا بہت بڑا دائرہ بنا۔ ایسا لگا جیسے کسی ماما بھری ماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی ہو اور وہ ہنس کر محبت بھرے لہجہ میں کہہ رہی ہو: "آؤ، میرے بچّو آؤ، یہ پانی تمہارے ہی لئے جمع کیا ہے میں نے۔ اس کی جس بوند سے تمہارا گلا تر ہو جائے گا اُسے امرت کہوں گا۔ جھرنے کی دھار کو بھی میں نے اسی لئے نہیں روکا کہ وہ پیاسے ہرنوں، بکریوں، کتّوں اور لڑکوں کے سوکھے حلق کو تر کر کے اُن کی جان بچائے۔"

"یہ گڑھا بڑا رحم دل ہے۔ سب کو پانی دیتا ہے۔ کسی کو پیاسا نہیں جانے دیتا۔ ہر سال برسات میں بہت سا پانی اس میں بھر جاتا ہے۔ یہ جھرنے کی دھار سوکھنے نہیں دیتا اسے برابر پانی دیتا رہتا ہے —— ہٹلر آؤ، میرے دوست! پہلے تم پیو، خوب جی بھر کر پیو۔ پھر میں پیوں گا۔"

ہٹلر پیاس سے بے تاب تھا۔ اُس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ لیکن اُس نے گڑھے میں مونہہ نہیں ڈالا۔ محبّت بھری آنکھوں سے امجد کو دیکھتا رہا، جیسے کہہ رہا ہو "پہلے آپ پئیں، میرے ساتھی، میرے آقا۔ میں پہل نہیں کر سکتا۔ یہ بات وفاداری کے خلاف ہے۔ اور میری قوم تو ازل سے وفادار رہی ہے۔"

"میں سمجھا، ہٹلر!" امجد نے کہا "تم چاہتے ہو کہ پہلے میں پانی پی لوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ پہلے تمہیں پانی پینا ہوگا۔ سنو ہٹلر، ہمارے ملک میں ایک بڑا انصاف پسند

بادشاہ گزرا ہے۔ اس کا نام شیرشاہ تھا۔ اُس نے ایک بہت بڑی سڑک بنائی تھی اس کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر غریبوں اور مسافروں کے ٹھہرنے کے لئے بہت سی سرائیں بنوادی تھیں جہاں کھانا بھی ملتا تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ وہ رات کو دسترخوان پر بیٹھتا تو اونچے اونچے ٹیلوں پر جہاں بہت سا ایندھن رکھا رہتا تھا آگ جلادی جاتی تھی۔ پہلے ٹیلے کی روشنی دوسرے ٹیلے تک پہنچتی تو وہاں بھی ایندھن میں آگ لگادی جاتی اس کی روشنی دیکھتے ہی مسافروں کو کھانا بانٹ دیا جاتا۔ اس طرح بادشاہ کے ساتھ دور تک بنی ہوئی سراؤں میں ٹھیرے ہوئے مسافروں کو کھانا مل جاتا —— میرے پیارے ہٹلر، میں بھی اس موقع پر شیرشاہ کے نقشِ قدم پر چلوں گا بہتر یہ ہے کہ ہم دونوں ساتھ ہی ساتھ پانی پئیں۔ ادھر میں چلّو میں پانی لے کر مونھ میں ڈالتا ہوں، اُدھر تم اپنی تھوتھنی صاف ستھرے گڑھے میں بھرے ہوئے پانی میں ڈالو"

یہ تجویز بہت معقول تھی۔ دونوں نے اپنی اپنی پیاس بُجھائی اور تھوڑی دیر وہاں ٹھیر کر گڑھے کی بہت تعریف کی۔ امجد نے کہا "خدا کرے تم اسی طرح کناروں تک بھرے رہو۔ تمہارے اندر موجیں ہمیشہ ناچتی رہیں، پیاسے ہمیشہ اپنی پیاس بُجھاتے رہیں۔ تمہارا پانی کبھی خشک نہ ہو"

امجد ہٹلر کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ اس نے تھوڑا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ خوب موسلادھار مینہ برسنے لگا۔ امجد نے مڑ کر دیکھا۔ جھرنے کی دھار تیز ہوگئی تھی۔ گڑھا کناروں تک بھر گیا تھا۔ امجد بھاگتا ہوا دوسرے گڑھے پر پہنچا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہر طرف بادل چھائے ہوئے ہیں گرج کی آوازیں آرہی ہیں۔ لیکن گڑھے کے آس پاس دُھول اُڑ رہی ہے۔ اس کا مددگار جھرنا سُوکھا پڑا ہے۔ وہاں مینہ بالکل نہیں برس رہا تھا۔ امجد نے ایک پتھر اُٹھا کر گڑھے میں پھینکا اور اونچی آواز میں بولا :
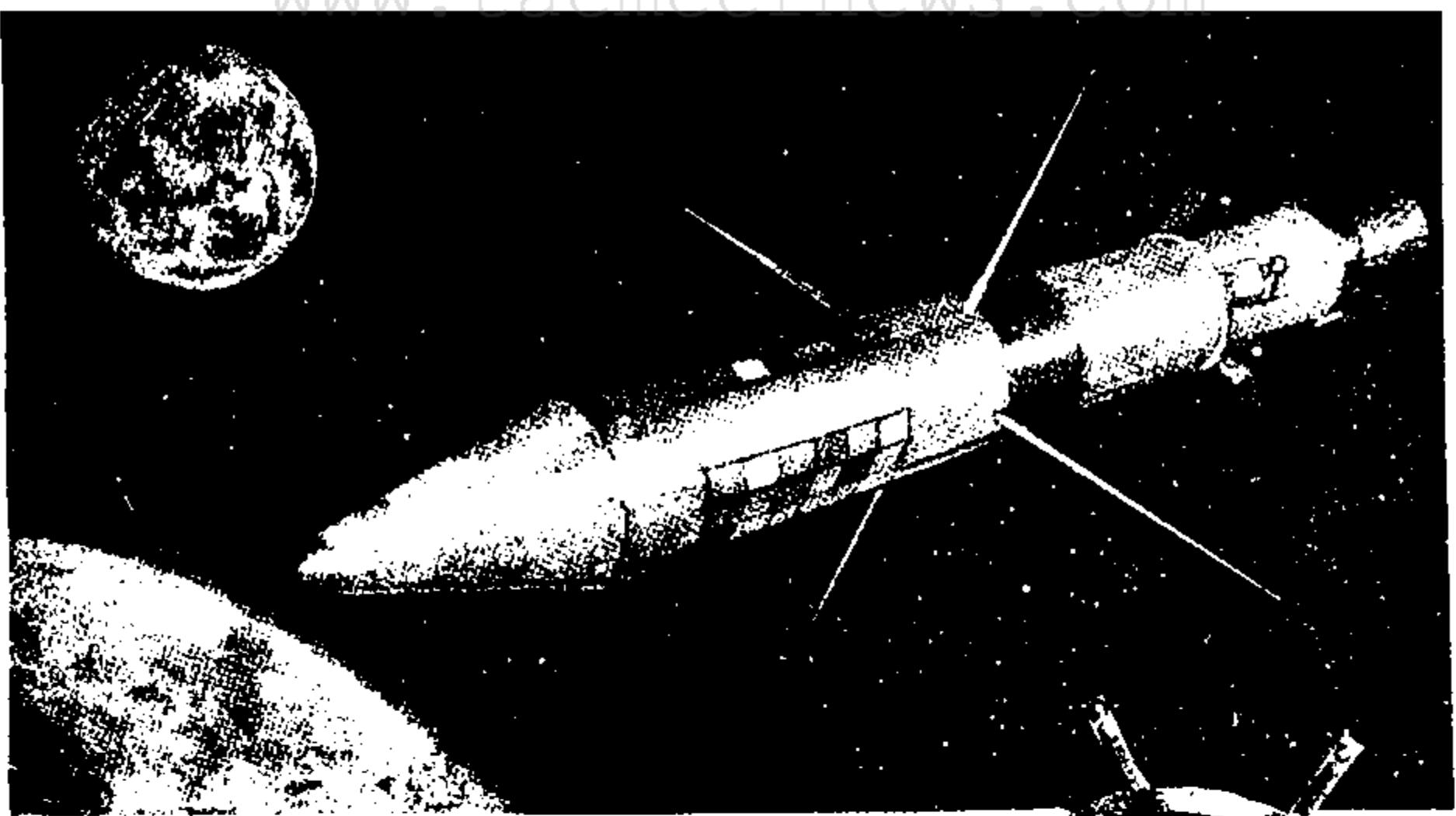
نرس میرے بیٹے کے کپڑے بھی اُتار دو —— وہ میری طرح ننگا کیلوں کے بستر پر لیٹے گا

"تم ہماری پیاس بُجھادیتے تو یہ بُرا وقت نہ دیکھنا پڑتا۔ تمہارے اوپر بھی مینہ برستا اور جل تھل کر دیتا۔ دوسرے گڑھے پر اتنی بارش ہوئی ہے کہ وہ کناروں تک بھر کر اُبل چکا ہے۔ اُس نے ہمیں پانی پلایا تھا نا! اُسے اگلے سال کی فکر نہ تھی۔ اُسے تو ہر پیاسے کے ساتھ ہمدردی تھی۔ وہ پانی اکٹھا نہیں کرتا تھا۔ سب کی پیاس بُجھانا ثواب سمجھتا تھا"۔

چلتے وقت امجد نے ایک مُٹھی دُھول گڑھے میں جھونک دی۔ ہٹلر زور زور سے بھونکنے لگا۔ شاید وہ کہہ رہا تھا کہ اس ذخیرہ اندوز گڑھے کو پاٹ دینا چاہئے۔ کنجوس اور خود غرض کو کبھی آرام نہیں ملنا چاہئے۔

●●

کے، پی، سکینہ

کردار

(سارے کردار بچے ہیں .... میک اَپ کی مدد سے وہ اپنے اپنے رول ادا کر رہے ہیں)

مسٹر اَلبرٹ : ایک بیٹو قسم کا شخص۔

ایبیا : مسٹر البرٹ کا نوکر۔

ڈاکٹر افلاطون : مسٹر البرٹ کا دوست۔
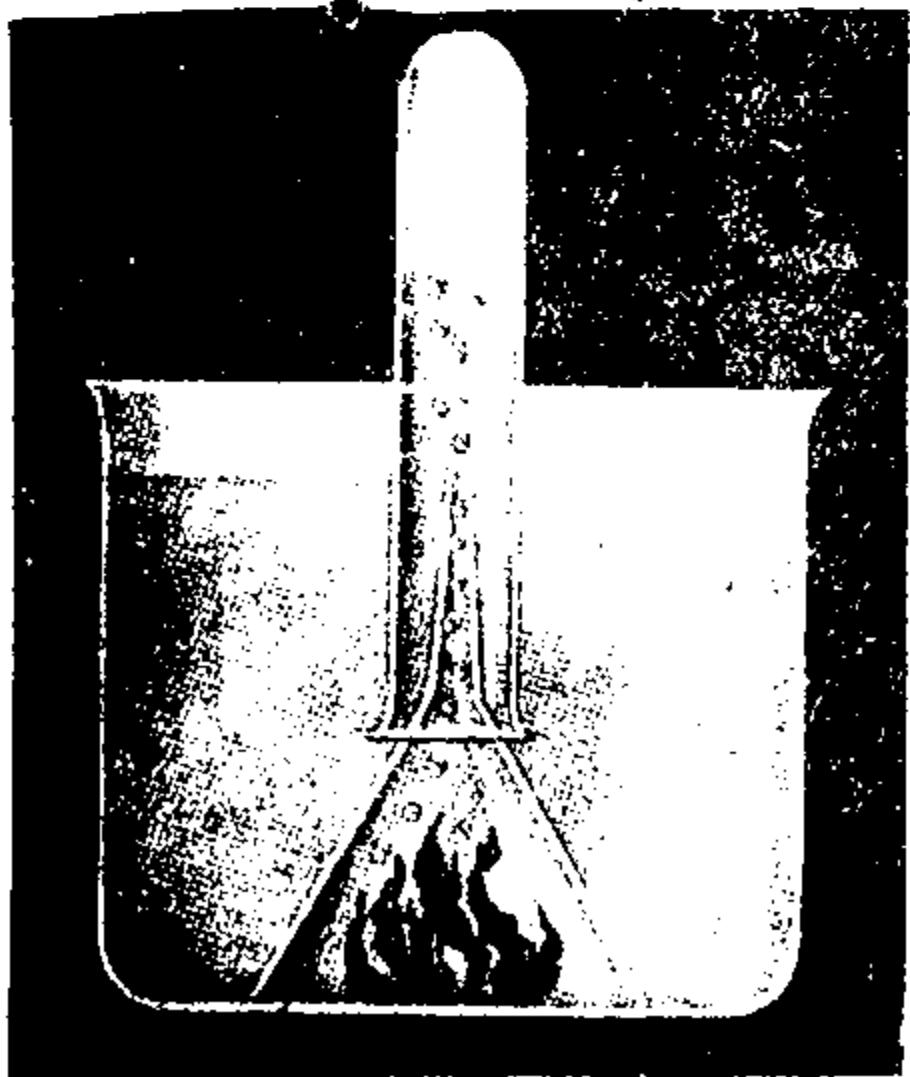
بابو عدالتی چند : مسٹر البرٹ کے وکیل دوست .... اور

ثانی .... (مسٹر البرٹ کا چھوٹا لڑکا) ۔

(پردہ کھلنے پر مسٹر البرٹ اپنے سامنے میز پر ناشتہ سجائے بیٹھے ہیں۔ اور ایک اُبلا ہوا انڈا میز پر ٹھونک کر اس کا چھلکا توڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انڈے کا چھلکا توڑے نہیں ٹوٹتا۔)

مسٹر البرٹ : ایبا! .... اَبے او ایبا کے بچے! ....

ایبیا : (دوڑا آتا ہے) جی حضور!

البرٹ : یہ اَنڈا ہے؟

ایبیا : مجھے انڈا ہی نظر آتا ہے۔ ویسے حضور کو تربُوز نظر آتا ہو تو دیگر بات ہے۔

آپ کا ٹیلی فون ہے سر — یہیں سن لیجئے

البرٹ: خاموش بدتمیز۔ یہ اُبلا ہوا انڈا چھلنے سے کیوں انکار کر رہا ہے؟ چھلکا ٹوٹتا ہی نہیں!

ایبا : حضور انڈا ٹوٹنے کا مُوڈ نہیں ہوگا! میں بھلا کیا دخل دے سکتا ہوں۔ ویسے ہو سکتا ہے کہ انڈا کسی سنگ دل مرغی نے دیا ہو۔ اور اس کا چھلکا پتھر ہو گیا ہو۔

البرٹ: کم بخت تجھے مذاق سوجھ رہا ہے۔ اب ہم ناشتہ کاہے کا کریں گے؟

ایبا : حضور کافی ناشتہ موجود ہے! دو کلو کاجو ہیں۔ پانچ پلیٹ جلیبیاں ہیں.... دو ٹن بسکٹ ہیں!

البرٹ: مگر انڈا تو ایک ہی ہے۔ ہمیں انڈا چاہئے!.... فوراً انڈے کا چھلکا توڑا جائے۔

ایبا : بہتر ہے۔ میں ابھی چھلکا توڑ کر لاتا ہوں ۔ باہر سڑک کوٹنے کا انجن چل رہا ہے.... اس کی مدد سے۔

البرٹ: (بات کاٹ کر) نامعقول رہنے دے.... دیکھ باہر کوئی گھنٹی بجا رہا ہے۔

(ڈاکٹر افلاطون اپنا آلہ لٹکائے تشریف لاتے ہیں)

افلاطون: بھئی واہ! صحیح وقت پر آیا! لائیے انڈا ادھر سرکا دیجئے.... باقی مال آپ ہڑپ لیجئے۔

البرٹ: آپ کے بازوؤں میں قوت ہو تو انڈے کا چھلکا توڑ دیجئے۔

افلاطون: کیا مطلب۔

البرٹ: مطلب یہ کہ انڈے کا چھلکا کسی صورت نہیں ٹوٹ رہا ہے۔ یہ عجیب وغریب قسم کا انڈا ہے۔

افلاطون: (خوش ہوکر) واہ! اس انڈے پر خاصی ریسرچ ہو سکتی ہے.... ایبا.... ایبا!

ایبا : (دوڑا آتا ہے) جی حضور ڈاکٹر صاحب۔

افلاطون: ایبا! کیا اُبلتے وقت اس انڈے کا ٹمپریچر اور بلڈ پریشر نارمل تھا؟۔

ایبا : بالکل نارمل تھا حضور! دیگچی میں ٹناٹن اُچھل رہا تھا؟

افلاطون: اور اس کی دماغی کیفیت۔

ایبا : کافی خوش نظر آتا تھا.... اُبلتے پانی میں خوشی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

افلاطون: کیا اس واقعے سے قبل کبھی تمہارے کچن میں کسی انڈے کو چھلکے کا مرض ہوا؟

ایبا : (حیرت سے) چھلکے کا مرض۔

افلاطون: ہاں ہاں! جیسے انسان کو جلدی امراض مثلاً خارش، پھوڑے، پھنسی وغیرہ ہوتے ہیں۔

ایبا : جی نہیں! ہمارے وہاں سارے انڈوں کی جلد کافی صحت مند رہی ہے۔

افلاطون: یہ کیس نہایت پیچیدہ ہے۔ مجھے میڈیکل بورڈ سے صلاح مشورہ کرنا ہوگا۔

البرٹ : بکواس بند کرو ڈاکٹر۔ یہ سوچو کہ اس کا چھلکا کیسے اُتارا جائے ۔؟

افلاطون : مجھے لگتا ہے کہ یہ سارا کرشمہ اس انڈے کے اندر بند چوزے کا ہے ۔ چوزہ نہایت انقلابی اور شریر نظر آتا ہے ۔ وہی چھلکے کو ٹوٹنے نہیں دے رہا ہے ۔ اِس چوزے کے ختم کرنے کے لئے انڈے میں زہر کا انجکشن دینا ہوگا ۔ چوزہ ختم ہوجائے گا۔ اور چھلکا ٹوٹ جائے گا ۔ آیا عقل کے بیچ میں ؟

البرٹ : آگیا ۔ مگر اس انڈے کو کھانے سے زہر پیٹ میں چلا جائے گا۔

افلاطون : صحیح فرمایا آپ نے زہر کو زہر ہی مارتا ہے ۔ انڈا کھانے کے فوراً بعد ایک گلاس زہر پینا ہوگا۔

(البرٹ کے دوست مسٹر بابو عدالتی چند وکیل اپنی فائلیں سنبھالے داخل ہوتے ہیں ۔)

عدالتی چند : یہ کون زہر نوش فرما رہا ہے ؟ ۔ تعزیرات ہند کے تحت خودکشی قانوناً جرم ہے ۔

البرٹ : آیئے بابو عدالتی چند ! سارے فساد کی جڑ یہ انڈا ہے ۔ جو ٹوٹنے سے انکار کر رہا ہے ۔

عدالتی چند : یہ بھی قانوناً جرم ہے ۔ اُبلے ہوئے انڈے کو ٹوٹنا ہی ہوگا ۔ یہ اُس کا فرض ہے ۔ انڈا میرے حوالے کر دیجئے تاکہ قانونی کارروائی کی جاسکے ۔

افلاطون : جی ہاں اور آپ اکیلے انڈا ہڑپ کر جائیں ۔؟ انڈے کے ناشتے میں ہم برابر کے شریک ہیں۔

عدالتی چند : اَیبا ! ..... ایبا ! .... (نوکر ایبا حاضر ہوتا ہے)
اس انڈے کے متعلق تم کیا جانتے ہو۔

ایبا : حضور وکیل صاحب ! صرف اتنا کہ یہ انڈا ہے ! .... رحمت میاں انڈا فروش

یہ کیڑے تو میرا جادوئی غلیچہ ہی کھا جائیں گے

کے وہاں سے آج صبح پانچ بج کر تیس منٹ بائیس سیکنڈ پر تیس پیسے میں خریدا گیا ہے ۔ بس اور کچھ نہیں ۔

عدالتی چند : اس کے والدین کو گواہ کے طور پر طلب کرنا ہوگا۔

ایبا : حضور میں یتیم ہوں ! والدین اللہ کو پیارے ہو چکے ۔

عدالتی چند : تمھارے نہیں ! انڈے کے والدین کی بات کر رہا ہوں ۔

ایبا : حضور انڈا بھی یتیم ہے ۔ رحمت میاں انڈا فروش فرما رہے تھے کہ انڈا دے چکنے کے بعد اس غریب انڈے کی والدہ بی مرغی ایک حادثے میں تانگے کے نیچے ہلاک ہوگئیں اور اس کے ابا میاں مرغا کل شام بہ حیثیت مرغ مسلّم کام آگئے ۔ (آنسو پونچھتا ہے)

عدالتی چند : تو کیوں روتا ہے ۔ تیرا اس انڈے سے

ممی یہ تو تحفوں کی دُکان ہے پھر آپ قیمت کیوں دے رہی ہیں؟

کیا رشتہ ہے ـــ؟

ایبا : حضور ہم دونوں یتیم ہیں۔ اگر آپ لوگ اسے یوں ہی پلیٹ میں چھوڑ دیں تو میں اس سے اپنے ناشتے کا رشتہ بھی جوڑ سکتا ہوں۔

عدالتی چند : تم جا سکتے ہو۔ سرکاری گواہ کی حیثیت سے تمھیں پھر طلب کیا جا سکتا ہے۔

افلاطون : اب وکالت ہی جھاڑتے رہوگے ۔ یا انڈا توڑو گے بھی؟

البرٹ : ہماری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے! ....

عدالتی چند : خاموش رہیے! یہ نہایت سنگین کیس ہے! کافی چھان بین کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انڈا سیل بند کرکے بڑی عدالت کے سپرد کر دیا جائے!.... اس انڈے کے پس منظر کسی دشمن کی گہری سازش معلوم ہوتی ہے....

افلاطون : آپ انڈے کو بھی قانونی گرفت میں لے گئے؟

.... یہ ایک میڈیکل کیس ہے! اسے لیبوریٹری میں لے جا کر اس کی کیمیاوی جانچ کروں گا.... اس کی رپورٹ گورنمنٹ تک بھیجی جائے گی....

البرٹ : آپ میں سے کوئی اس انڈے کو مجھ سے جدا نہیں کر سکتا۔ میں اسے یوں ہی نگل جاؤں گا۔

(تینوں آپس میں تکرار اور تو تو میں میں پر اتر آتے ہیں.... ایبا پریشان کھڑا ہے۔)

(مسٹر ثانی (بچہ) روتے ہوئے آتے ہیں۔
اُن کے دونوں ہاتھوں سے انڈا بہہ رہا ہے)

ثانی : ڈیڈی! ہمارا اندا تہاں ہے؟ (ہمارا انڈا کہاں ہے)

البرٹ : کون سا انڈا؟

ثانی : تل آپ ہمالے متی کے تھلونے لائے تھے۔

(کل آپ ہمارے لئے مٹی کے کھلونے لائے تھے۔)

.... متی کا آم تھا.... بیلا تھا (کیلا تھا) املود (امرود) تھا۔ متی کا اندا بھی تھا.... ہم تھیلنے لگے تو اندا پھوت گیا.... ہمارا متی والا اندا تہاں ہے؟

ایبا : باپ رے میں مر گیا۔ کھیلے میں انڈا بدل گیا ۔ اصلی انڈا ثانی بابا کے کھلونوں میں چلا گیا.... اور مٹی کا انڈا اُبال ڈالا گیا! کتنا پختہ اور اصلی بنائے ہیں کھلونے والے.... میرا کیا قصور۔

(تینوں دوست قہقہہ لگاتے ہیں۔)

البرٹ : لو بھئی ثانی بابا! اپنا انڈا لے جاؤ اور کھیلو!.... ایبا! ہم لوگوں کے لئے فٹافٹ تین انڈے اُبال لاؤ۔

عدالتی چند اور افلاطون : (بیک آواز) مگر دھیان رہے کہ تینوں انڈے اصلی ہوں۔

(سب ہنستے ہیں.... پردہ گرتا ہے) ●●

بادشاہ سلامت

ہاجرہ نازلی

"چل گھونچو! تجھے کیا خبر ہوائی جہاز کس طرح بنتا ہے!" مکّو نے کہا۔

"جیسے تو نے تو سینکڑوں ہوائی جہاز بنا کر اڑا دیے"۔ فیضو نے جواب دیا۔

"کبھی اُڑا بھی دوں گا"، مکّو بولا "دیکھنا ایک ایسا دن ضرور آئے گا کہ میں شان سے بادشاہ سلامت کی طرح ہوائی جہاز میں بیٹھا ہوا ہوں گا اور پھر وہ جہاز زوں سے تیرے سر پر سے اُڑ جائے گا۔"

"تو نرا ڈیوٹ ہے"، فیضو نے ہنس کر کہا "بلی کو خواب میں چھیچھڑے نظر آ رہے ہیں۔ رہنے کو گھر نہیں، کھانے کو ٹکڑا نہیں اور "بادشاہ سلامت" زوں سے ہوائی جہاز اُڑا رہے ہیں! کبھی خواب میں بھی ہوائی جہاز دیکھا ہے؟"

"ارے ڈیوٹ کے بچے! میں خوب محنت کرکے پڑھوں گا۔ پھر دیکھنا میری شان۔ تو ہی مجھے جھک کر سلام کرے گا۔" مکّو نے ہنس کر جواب دیا۔

"چل چل! مجھے بھی سلام کرنے کو تو ہی ملے گا کیا؟" فیضو نے طنز سے کہا "پانچویں کلاس میں پڑا ہے اور ہوائی جہازوں کے خواب دیکھ رہا ہے۔ مجھے تو اب ڈر ہو گیا کہ ملک کے سارے انجینئر زہر کھانے کو سوچ رہے ہوں گے کیوں کہ ایک بڑا زبردست انجینئر نمودار ہونے والا ہے جس نے پانچویں کلاس سے ہی انجینئری لے رکھی ہے۔"

"تو تو کیوں جلتا ہے؟" مکّو نے قہقہہ لگایا "آج جو بڑے بڑے انجینئر ہیں انہوں نے پانچویں کلاس نہیں پڑھی تھی کیا؟"

"پڑھی تھی، مگر تیری طرح خود کو پانچویں ہی سے انجینئر نہیں سمجھا ہوگا۔"

"ہٹ ___ تجھے بات بھی کرنی نہیں آتی۔" مکّو نے کہا "میں ابھی سے تھوڑا ہی انجینئر بن گیا۔ پڑھ لکھ لوں تو بنوں گا۔"

"پیسہ کہاں سے آئے گا؟"

"لاٹری کا ٹکٹ خرید لوں گا۔"

"اوہو، جیسے لاٹری نکل ہی تو آئے گی۔ میری ماں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر پانچ دفعہ لاٹری کے ٹکٹ خریدے۔ خاک کبھی نہیں ملا۔ گھر سے پانچ روپے بھی گئے سو الگ۔ ہم جیسے فقیروں کی لاٹریاں نہیں نکلا کرتیں۔ تو بڑا آیا کہیں کا نواب ہے کہ تیری لاٹری نکلے گی۔ ایسی باتیں کسی اور سے کرنا۔" فیضو نے مکّو کی اُمیدوں پر پانی پھیرا۔

"خیر چھوڑ، نہیں خریدوں گا۔" مکّو نے دھیرے سے کہا "اللہ کوئی اور انتظام کردے گا۔"

"ہاں اللہ میاں کسی دن تیرے گھر میں روپوں کی بارش برسا دیں گے، یا پھر کسی روز تیرے گھر کا چھپر اڑڑ دھم کرکے گرے گا اور اس میں سے اشرفیاں ہی اشرفیاں نکل پڑیں گی ___"

"کسی کے تو نکلی ہی ہوں گی۔" مکّو نے کہا "تب ہی تو چھپر پھاڑنے کی بات مشہور ہوئی ہے۔"

"ہاں کسی کے نکلی ہوگی۔" فیضو دل دُکھا رہا تھا "اور اب دوسری دفعہ تیرے نکلیں گی۔"

"تو کچھ بھی کہہ، میں انجینئر ضرور بنوں گا۔" مکّو جوش سے بولا "میں نے ایک دن پڑوس کے سید صاحب کے لڑکے امجد سے اس کا چھوٹا سا ہوائی جہاز مانگ لیا تھا جو اس کے بڑے بھائی نے امریکہ سے بھیجا تھا۔ وہ چابی سے خوب گھومتا تھا زوں زوں کرکے، اور اس کے پیچھے سے لال لال روشنی بھی چمکتی تھی۔ وہ خراب ہو گیا تو میں اٹھا لایا تھا پھر اسے سارے کو کھول کر میں نے دیکھا کہ کیسے بنایا گیا تھا سب میری سمجھ میں آگیا کہ اس کا سسٹم کیا تھا۔"

"بس تو اب تو ایر انڈیا کمپنی میں چلا جا" فیضو نے کہا "دن میں دس بارہ جہاز روز بنا دیا کرنا۔ ملک کا بھی بھلا ہوگا اور تیرا بھی نام ہو جائے گا۔"

"ابھی اتنے بڑے جہاز کیسے بنا سکتا ہوں؟" مکّو ہنسا۔

"تو ایک آدمی کے بیٹھنے لائق بنا لینا۔" فیضو کھڑے ہو کر بولا "میں تو چلا، تو خواب دیکھتا رہ۔"

فیضو اور مکّو میں روزانہ اسی طرح جھڑپ ہوا کرتی تھی۔ دونوں ہم عمر اور ایک ہی محلّے کے بارہ چودہ سال کے لڑکے تھے۔ غریب بستی میں عام غریب بچوں کی طرح

غربت ہی میں پل بڑھ رہے تھے۔

منگو جس کا نام مقبول تھا، ہر وقت انجینئری کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ کہیں سے بھی کوئی ٹوٹا پھوٹا کھلونا مل جاتا تھا تو سارے سارے دن اس کے کھولنے، بنانے اور سمجھنے میں لگا دیا کرتا تھا۔ خود اس کو تو کبھی کوئی کھلونا میسر آیا ہی نہیں تھا۔ ماں باپ دو وقت کی روٹی ہی کا بندوبست نہ جانے کیسے کرتے تھے۔

وہ باپ کے سر ہو ہوا کر میونسپل اسکول میں داخل ہو گیا تھا۔ باپ نے بھی سوچا کہ بالکل جاہل رہنے سے یہ اچھا ہے کہ دو چار اردو، ہندی کی کتابوں کی شُد بُد ہو جائے۔ منگو خوب دل لگا کر پڑھتا تھا۔ امتحان میں اچھے خاصے نمبر مل جاتے تھے۔

فیضو بھی اسی اسکول میں منگو کا ہم جماعت تھا۔ دونوں میں کافی دوستی تھی، لیکن فیضو کو اپنی غربت کا ضرورت سے زیادہ احساس تھا۔ احساس تک بھی غنیمت تھا، مگر اس کے ذہن میں تو یہ جما ہوا تھا کہ ہر ترقی کی راہ میں غربت رکاوٹ بن جاتی ہے، ہر حوصلہ غربت کی چکی میں پس جاتا ہے وہ منگو کے بلند ارادوں اور اونچی سوچوں کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ منگو ناسمجھ اور کم عمر تھا۔ اس کو فیضو کی باتیں پسند نہیں آتی تھیں، لیکن وہ فیضو کو یہ بات سمجھانے سے قاصر تھا کہ احساسِ کمتری سے اپنی قوّتِ ارادی اور اپنے حوصلوں کو زنگ نہ لگاؤ، ارادے بلند رکھو اور اللہ کی ذات پر بھروسہ کرو۔ کوشش کرتے رہو، نہ جانے کب کامیابی مل جائے۔ مگر وہ فیضو کو اس انداز سے سمجھا نہیں سکتا تھا، اور جتنا وہ سمجھاتا تھا وہ فیضو کے کبھی سمجھ میں نہیں آتا تھا، بلکہ وہ اور زیادہ ہی مذاق اڑانے لگتا تھا۔

منگو اکثر دیر تک بیٹھا سوچتا رہتا تھا کہ غریب لو میں

اگر یہ کُتّا نہ ہوتا تو یقیناً انسان ہوتا

بھی ہوں لیکن میرے دماغ میں جیسی اونچی باتیں آتی ہیں وہ فیضو کے دماغ میں کیوں نہیں آتیں؟ وہ اس فرق کو سمجھ ہی نہیں سکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی اونچی اونچی باتوں کا کچھ حصہ اپنے ہاتھ سے فیضو کے دماغ میں بھر دے تاکہ وہ بھی ایسی ہی باتیں سوچنے لگے۔ لیکن اس کی یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے خیالات دوسرے کے دماغ میں کس طرح اتارے جاتے ہیں اور دوسرے کو اپنا ہم خیال کیسے بنایا جاتا ہے۔

وہ فیضو کے احساسِ کمتری سے کُڑھ کر رہ جاتا تھا۔ اپنی بات سمجھانے کی امکان بھر کوشش ضرور کرتا تھا، مگر فیضو کے طنز بھرے جواب سے وہ خود بھی کچھ کچھ پریشان سا ہو جاتا تھا بلکہ اپنی کم علمی کی بدولت کبھی کبھی اس کے طنز حقیقت سے زیادہ قریب نظر آنے لگتے تھے۔ لیکن یہ وقتی اثر ہوتا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کے اپنے خیالات ابھر کر پھر اپنا وزن ثابت کرنے لگتے تھے۔

فیضو اسکول تو جاتا تھا،
لیکن پڑھائی کے بارے میں

بھی وہ سنجیدہ نہیں تھا۔ ٹکّو کو توجہ دِلانے پر وہ کہتا "ارے چھوڑو، اس جیل خانے جیسے اسکول میں پڑھ کر میں بڑا کہیں کا تھانے دار بن جاؤں گا۔ باپ نہ مارے مینڈکی، بیٹا گولنداز۔ ہم جیسے غریب پڑھا پڑھایا نہیں کرتے۔ اسکول بھی ماں کے ڈر سے چلا جاتا ہوں، وہ بہت مارتی ہے نا۔"

ٹکّو گھُٹ کر رہ جاتا تھا۔ اس کی سمجھ میں وہ الفاظ ہی نہیں آتے تھے جن سے وہ فیضو کو تعلیم کی اہمیت بتا سکتا۔ اور اپنے حوصلے بھر وہ جس طرح اس کو سمجھاتا تھا وہ کچھ ایسا نامکمل اور بے ربط ہوتا تھا کہ فیضو کی طنز بھری ہنسی سے خود ٹکّو ہی شرمندہ ہو جاتا تھا۔ اکیلے میں بیٹھ کر وہ کافی سوچتا تھا اور خاصی تقریر سی ذہن میں بنا لیتا تھا کہ یہ کہوں گا وہ کہوں گا، اور اگر وہ اعتراض کرے گا تو یہ جواب دوں گا۔ مگر جب فیضو سے بات کرتا تھا تو وہ ساری تقریر اور سارے جواب نہ جانے دماغ سے کہاں غائب ہو جاتے تھے۔

ٹکّو خود بہت پڑھنا چاہتا تھا۔ اس کے بھی غریبی آڑے آتی تھی، لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہر رکاوٹ کے باوجود پڑھے گا۔

میونسپل اسکول میں نہ فیس کا جھگڑا تھا، نہ یونیفارم کی اتنی پابندی تھی۔ کتابوں کا بھی مختلف ادارے انتظام کرتے تھے۔ وہ سوچتا تھا میٹرک تک تو غریبی میں بھی کھینچ ہی لوں گا آگے اللہ مالک ہے۔ اگر شوق ہے تو ہر رکاوٹ دُور ہو جاتی ہے اور شوق نہ ہو تو ہر آسانی دشواری بن جاتی ہے۔

فیضو جب بھی ٹکّو کو کتابوں پر جھکا دیکھتا تو اس کی کمر پر کرارے کرارے دھپ جما کر کہتا "کتنی ڈگریاں مل چکی ہیں کتنی باقی ہیں؟"

"ابھی تو باقی ہی باقی ہے۔" ٹکّو گردن اٹھا کر کہتا۔

"اچھا اب کتابوں کو تو رکھ اُٹھا کر طاق میں ——" فیضو نے اس کا ہاتھ گھسیٹا "آج گلی ڈنڈے کا بڑا بھاری میچ ہے۔ چل تجھے ریفری بنا دیں گے۔"

"اوہو، تجھے تو انگلش بولنی بھی آتی ہے!" ٹکّو نے ہنس کر کہا۔

"ایک آدھ لفظ تو سب ہی جانتے ہیں۔" فیضو نے کہا۔

"تو یار کیوں نے تھوڑی سی اور سیکھ لیں۔" ٹکّو بولا۔ "پھر دونوں ٹھاٹ سے گِٹ پِٹ کر کے بولا کریں گے۔ سب پر خوب رُعاب (رُعب) پڑے گا۔"

"پھر تو تُو بالکل ہی بادشاہ سلامت لگے گا۔" فیضو نے عادت کے مطابق طنز کیا۔ "یار تیرے دماغ میں کیا خبط سمایا ہوا ہے۔ میں تو یونہی غریب بھلا۔"

"مگر فیضو غریب رہنے میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔" ٹکّو سمجھانے پر تُلا رہتا تھا۔

"پھر تُو غریب کیوں ہے۔ بن جا بادشاہ سلامت۔ کس نے روکا ہے؟" فیضو پر کوئی اثر نہیں تھا۔

"ایک دم کیسے بن جاؤں۔" ٹکّو نے کہا "آہستہ آہستہ بنوں گا اور تجھے بھی بنا کر رہوں گا۔"

"واہ رے میرے شیر۔" فیضو بولا "خود تو غربت کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے، چلا ہے مجھے بادشاہ بنانے۔"

"تو کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔" ٹکّو پست ہو کر بولا۔

"ایسی تیسی تیری کوشش کی۔" فیضو نے کہا "تیری بادشاہت تجھے پاگل کر کے چھوڑے گی۔ کچھ دن میں بادشاہ سلامت اینٹیں مارتے نظر آئیں گے۔"

دونوں کی بات چیت ہمیشہ اسی بے تکی تکرار پر ختم ہوا کرتی تھی۔ فیضو اُٹھ کر چلا جاتا تھا اور ٹکّو سوچتا رہ جاتا

تھا۔ پھر نئی کتابوں میں کھو جاتا تھا۔

مکّو اپنی تعلیم میں تن من سے لگا ہوا۔ دن رات محنت کرتا تھا۔ کھیل کود سے وہ بالکل بے زار ہوگیا۔ بس چوبیس گھنٹے اس پر ایک ہی دُھن سوار رہتی تھی! وہ فیضو کو بھی سمجھاتا تھا۔ مگر اس کے دماغ میں غریبی کے بھوت نے ایسے پنجے گاڑ رکھے تھے کہ وہ موری کے کیڑے کی طرح وہیں رینگتا رہ گیا۔

مکّو کی محنت کا نتیجہ شان دار رہا۔ وہ میٹرک کے امتحان میں فرسٹ آیا تھا۔ سب نے اسے شاباشی دی۔ مکّو کا چہرہ اپنی کامیابی پر چمک رہا تھا۔

اور پھر نئے سال سے اسے کالج میں نہایت آسانی سے داخلہ مل گیا۔ ایک نیک دل آدمی کی مہربانی سے فیس کا انتظام ایک ٹرسٹ سے ہوگیا تھا اور وہ پھر اپنے دیکھے ہوئے خوابوں کو پورا کرنے میں جُٹ گیا۔ اس نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا کہ دنیا اپنے محور پر گھوم رہی ہے یا اس کی گردش رُک چکی ہے۔ ظاہر ہے اس لگن اور محنت کا نتیجہ شان دار ہی رہتا تھا —— اور وہ اپنی اس شان دار ترقی کے ساتھ فیضو کو بھی دیکھ رہا تھا جو نویں کلاس تک نہ جانے کس طرح گھسٹ گھسٹا کر پہنچا تھا کہ اس کی طبیعت اُوب گئی اور اس نے تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا۔ مکّو نے لاکھ سر پٹخا مگر فیضو نہ مانا —— پھر کسی کارخانے میں مزدوری کر لی۔ اس کے حالات بدستور تھے۔ گھر پر غریبی کا مستقل ڈیرا تھا۔

مکّو جو اب مقبول احمد بن چکا تھا، اپنے دوست کی حالت پر افسوس کرتا تھا۔ لیکن فیضو اب بھی قسمت پر الزام رکھتا تھا۔ ایسے لوگ زبان سے ضرور قسمت کے سر سارا الزام منڈھتے ہیں مگر ان کا دل زبان کی تردید کرتا رہتا ہے اپنی نااہلی کو قسمت کے سر تھوپنا بے وقوفی ہی تو ہے۔

میاں پڑھاکو
یہ ناول پڑھ رہا ہے، اسے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا

مکّو یعنی مقبول احمد نے انجینئرنگ کا کورس مکمل کرلیا اور اس میں اعلیٰ پوزیشن حاصل کی۔ پھر ایک بڑی کمپنی میں وہ بطور اسسٹنٹ انجینئر بن گیا۔

ایک روز فیضو نے اخبار میں مکّو کی تصویر دیکھی اس کے نیچے خبر درج تھی:

ملک کے ہونہار نوجوان مقبول احمد اپنی کمپنی کی طرف سے انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ جارہے ہیں —— ایئر انڈیا کے بوئنگ سے روانہ ہوں گے۔

فیضو کی نظریں اس تصویر اور خبر پر جم کر رہ گئیں اس کو محسوس ہو رہا تھا جیسے مکّو سچ مچ بادشاہ سلامت بنا ہوا شان سے ہوائی جہاز میں بیٹھا ہوا ہے اور فیضو اس کو جھک کر سلام کر رہا ہے اور پھر وہ ہوائی جہاز زُوں سے فیضو کے سر پر سے اُڑ گیا۔

اس تصویر
میں دو سیدھی
لائینیں اس طرح کھینچو
کہ سولہ تکونیں برابر کے سائز کی
بن جائیں۔ اپنا جواب (اور سالنامہ میں
شائع ہونے والے دوسرے مقابلوں کے جواب)
۲۲ فروری تک "تکونا سوال، ماہنامہ کھلونا، آصف علی روڈ،
نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۱ کے پتے پر بھیج دو۔ صحیح جواب بھیجنے والے
دس بہن بھائیوں کو دو دو روپے نقد انعام دئے جائیں گے۔

تکونا سوال، ماہنامہ کھلونا، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۱

کیف احمد صدیقی

محنت سے ہر قدم پر ملتی ہے کامیابی
محنت کرو کہ محنت ہر کام کی ہے چابی

محنت کرو کہ جس سے آئے بدن میں چستی
بھولے سے بھی کبھی پل آنے نہ پائے سستی
دنیا میں کاہلی ہے سب سے بڑی خرابی
محنت کرو کہ محنت ہر کام کی ہے چابی

محنت سے پڑھنے والا پاتا ہے خوب نمبر
پڑھنے کے بعد بنتا ہے باوقار افسر
پھر ساری عمر کرتا رہتا ہے وہ نوابی
محنت کرو کہ محنت ہر کام کی ہے چابی

کرتا نہیں جو محنت ہوتا ہے وہ پھسڈی
فٹ بال ہو کہ ہاکی، کرکٹ ہو یا کبڈی
محنت سے کھیل میں بھی ملتی ہے کامیابی
محنت کرو کہ محنت ہر کام کی ہے چابی

محنت کرو کہ محنت ہے باعثِ ترقی
وہ ایورسٹ ہو یا آکاش کی بلندی
محنت سے ہر جگہ پر ہوتی ہے باریابی
محنت کرو کہ محنت ہر کام کی ہے چابی

محنت سے آج دیکھو پہنچے ہیں ہم کہاں تک
پرواز کر رہے ہیں ذرے بھی آسماں تک
انساں زمیں سے پہنچا تا شہرِ ماہتابی
محنت کرو کہ محنت ہر کام کی ہے چابی

قائم رہے ہمیشہ تا عمر جس کی مستی
اے کیف جس سے گزرے مستانہ وار ہستی
بچو! شرابِ محنت پی کر بنو شرابی
محنت کرو کہ محنت ہر کام کی ہے چابی
محنت سے ہر قدم پر ملتی ہے کامیابی

م۔ ندیم علیگ

کردار

افضل میاں
فضلو
چور
کوتوال
کچھ سپاہی

پہلا منظر

پردہ اٹھتا ہے۔ ایک مکان کا کمرہ۔ ادھیڑ عمر کے ایک صاحب اخبار پڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے سفید سی داڑھی ہے۔ آنکھوں پر چشمہ لگائے ہوئے ہیں۔ گلدان قریب ہی رکھا ہے۔ فضلو اندر داخل ہوتا ہے۔

فضلو: حضور، ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مسافر ہیں اور پریشان حال معلوم ہوتے ہیں۔

افضل میاں: ضرور ضرور۔ انہیں تشریف لانے دو۔

(مسافر اندر داخل ہوتا ہے۔ وہ ایک جوان آدمی ہے معمولی کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ ہاتھ میں ایک پوٹلی ہے)

مسافر: السلام علیکم۔

افضل میاں: وعلیکم السلام تشریف رکھئے۔ آپ کی تعریف؟

مسافر: غریب الوطن ہوں وطن کیا بتاؤں
نہیں ہوں میں گل تو چمن کیا بتاؤں
ایک پریشان حال انسان ہوں۔ ریل میں سفر کر رہا تھا کہ کسی نے جیب تراش لی۔ تین دن سے مسجد میں پڑا تھا مونہہ بند کئے، بس اللہ سے دعا کرتا تھا کہ رحم فرمائے۔ آج اس نے مدد کی اور آپ تک پہنچا دیا۔ اور کیا عرض کروں۔ زیادہ کہتے ہوئے شرم زبان پکڑتی ہے۔

افضل میاں: اللہ اپنا فضل کرے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

مسافر: میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں جناب کہ آپ نے مجھ سے مہربانی کا برتاؤ کیا اور ہمت افزائی کی۔

افضل میاں: نہیں میاں۔ اس میں شکریہ اور احسان مندی کی کیا ضرورت ہے۔ انسان کو ہر حال میں اللہ کا ہی شکر ادا کرنا چاہیئے (آواز دیتے ہیں) ارے فضلو میاں، دیکھو ہمارے دوست کے لئے جلدی سے کھانا لاؤ۔

فضلو: ابھی پیش کرتا ہوں سرکار۔

افضل میاں: آپ کھانا کھایئے اور یہ برابر والا جو کمرہ ہے، اس میں

آرام کیجئے۔ جب تک آپ کا دل چاہے میرے غریب خانے پر قیام کیجئے۔ سفر کے لئے بھی آپ کی خدمت میں کچھ پیش کر دوں گا۔ اچھا اب رات زیادہ ہو رہی ہے۔ سردی بھی بڑھ گئی ہے۔ آپ سے رخصت چاہوں گا۔ انشاء اللہ صبح ملاقات ہوگی خدا حافظ۔ شب بخیر۔
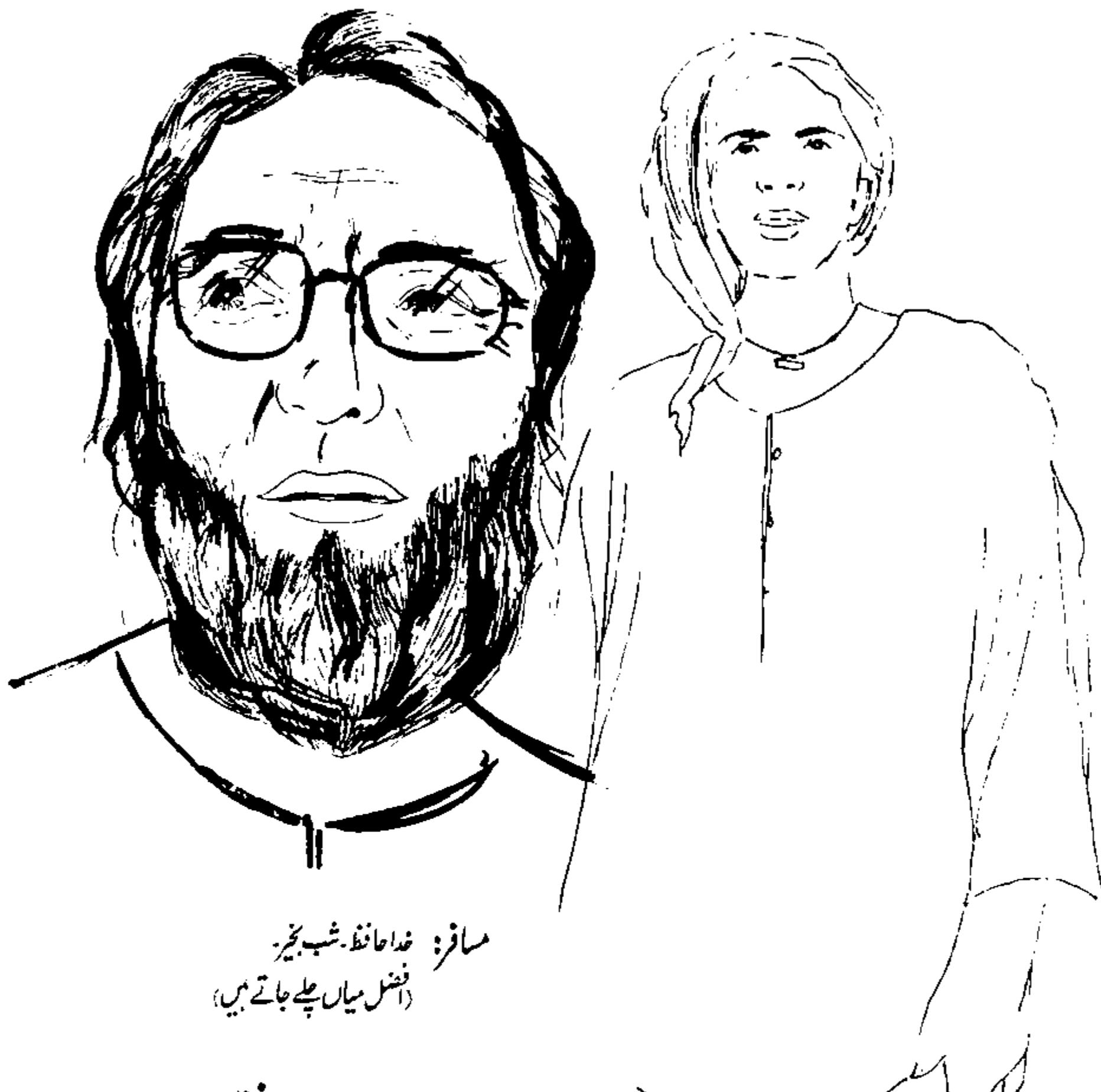
مسافر: خدا حافظ۔ شب بخیر۔

(افضل میاں چلے جاتے ہیں)

دوسرا منظر

(صبح کا وقت ہے۔ افضل میاں کرسی پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ سامنے فضلو کھڑا ہے)۔

فضلو: حضور! آپ بھی خوب آدمی ہیں! ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو اپنی ہی طرح شریف اور نیک انسان سمجھتے ہیں۔ اب دیکھئے نا!

مہربان بلی

وہ رات والا شریف انسان اور پریشان حال مسافر شاطر چور نکلا اور آپ کے خاندانی تبرکات چاندی کے برتن لے کر چمپت ہو گیا . . .

افضل میاں: (اطمینان سے حقے کا کش لگا کر) نہیں میاں فضلو، مجھے اب بھی یقین ہے کہ وہ چور نہیں تھا۔ شاید بے چارہ ضرورت مند تھا۔ کبھی کبھی ضرورت اور مجبوری بھی شریف انسان کو چور بنا دیتی ہے۔ اور وہ چاندی کے برتن ـــــــ وہ تو فالتو ہی تھے۔ اچھا ہوا کہ وہ لے گیا۔ اُس غریب کا بھلا ہو جائے گا۔

فضلو: (غصہ ہو کر) واہ میاں واہ! آپ کی بھی خوب منطق ہے۔ اور فالتو بھی ایک ہی کہی۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ فالتو چیزوں کی چوری کوئی جرم نہیں۔ دولت مند آدمیوں کی دولت اور سونا، چاندی جو ان کے گھر پر جمع رہتا ہے یا بینک میں رکھا رہتا ہے، وہ سب فالتو ہے اور اس کے حقدار آپ کے خیال میں شریف انسان یعنی چور اُچکے ہوئے! کیوں صاحب ہے نا یہی بات؟

افضل میاں: (ہنس کر) فضلو میاں۔ میرے خیال میں اگر دولت نہ ہو تو چوری کا سوال ہی نہ رہے۔ اگر مال دار لوگ اپنی دولت دبا کر نہ رکھیں اور اس کو انسانوں کی بھلائی پر خرچ کریں تو چور اور چوری دنیا سے ختم ہو جائے۔ خیر ختم کرو یہ قصہ۔ وہ جو کچھ لے گیا اس کی قسمت کا تھا۔ مجھے تو فکر یہ ہے کہ سردی اتنی شدید ہے، وہ بے چارہ رات کو نہ جانے کس وقت گیا ہوگا۔ کہیں اس کو نمونیا وغیرہ نہ ہو جائے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ دن میں چلا جاتا۔

فضلو: حضور، چوروں کو نہ سردی لگتی ہے، نہ نمونیا ہوتا ہے۔ اور وہ رات کو ہی چوری کیا کرتے ہیں۔ آپ کا چوروں کے لئے ہمدردی کرنا سراسر حماقت . . . . (کہتے کہتے رُک جاتا ہے) توبہ، میری توبہ ـــــــ احمق میں، میرا سر یعنی میں کہہ رہا تھا کہ حضور یہ آپ کی سادگی ہے۔ بس اب میں کسی مسافر وسافر کو نہیں پھٹکنے دوں گا۔ کم بخت چور! اُٹھائی گیرے! آجاتے ہیں۔ ہُوں ـــــــ

افضل میاں: نہیں بھئی، ایسا نہ کرنا۔ یہ میرا حکم ہے کہ جب بھی کوئی مسافر یا پردیسی اور پریشان حال آدمی آئے، اس کی خاطر کی جائے۔ ہر مسافر اور پریشان حال انسان چور نہیں ہوا کرتا۔ سمجھے!

فضلو: (بے دلی سے) سمجھ گیا حضور۔ آپ انسان نہیں فرشتہ ہیں، فرشتہ . . .

(کوتوال اور سپاہی داخل ہوتے ہیں۔ رات والا مسافر بھی ساتھ ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں پڑی ہیں۔ اور سر پر گٹھری رکھی ہے۔)

کوتوال: جناب افضل میاں صاحب آپ واقعی خوش قسمت انسان ہیں۔ آپ کا مال چور سمیت حاضر ہے ـــــــ ورنہ چوری گیا مال اور پنجرے سے اُڑا ہوا پنچھی بھلا کب ملتا ہے۔

پہلا سپاہی: بالکل ٹھیک فرماتے ہیں کوتوال صاحب۔

دوسرا سپاہی: یہ بڑا ہی شاطر چور ہے۔ اس نے مجھے بہت دوڑایا ہے جناب۔ بڑی مشکل سے ہاتھ لگا ہے کم بخت۔

افضل میاں: (حیرت سے) ارے بھئی کیسا چور؟ کس کی چوری؟ آپ لوگ کس کا ذکر کر رہے ہیں؟

کوتوال: (گٹھری کی طرف اشارہ کرکے) کیا یہ چاندی کے برتن آپ کے نہیں ہیں؟

افضل میاں: (برتن اٹھا کر دیکھتے ہیں) ہاں ہیں، بالکل ہیں۔ میرے پردادا قبلہ کا نام ان پر کھدا ہوا ہے۔ مگر پھر؟

کوتوال: یہ آدمی، جس نے یہ برتن چرائے ہیں، قبول کرتا ہے کہ آپ کے یہاں سے ہی یہ برتن چوری کئے ہیں۔

افضل میاں: (قہقہہ لگاتے ہیں۔ کوتوال اور سپاہی مونہہ پھاڑ کر ان کا مونہہ تکتے ہیں) ارے واہ کوتوال صاحب، واہ! جس طرح آپ میرے دوست ہیں، اسی طرح یہ آدمی بھی میرا ایک غریب دوست ہے، بچپن کا۔ میں نے یہ برتن اس کو تحفے میں دیئے ہیں۔

کوتوال: مگر یہ تو کہتا ہے کہ اس نے چوری کئے ہیں۔

افضل میاں: آپ نے ڈرایا دھمکایا تو بے چارے غریب نے ڈر کے مارے جھوٹ کہہ دیا کہ کہیں آپ اس کے ہاتھ پیر نہ سیدھے کر دیں۔

کوتوال: (سپاہیوں سے) ان کی ہتھکڑی کھول دو۔ لیجئے افضل میاں۔ (چور سے) جناب، سپاہیوں کو غلط فہمی ہوئی۔ زحمت کی معافی چاہوں گا۔

افضل میاں: زحمت تو آپ لوگوں کو ہوئی۔ ویسے آئندہ آپ چوروں کو پکڑنے میں احتیاط برتیئے گا۔ کہیں کسی بے قصور کو چور نہ بنا دیجئے گا۔

کوتوال: (کھسیانی ہنسی ہنس کر) نہیں جناب۔ اچھا اجازت دیجئے۔

(سپاہی اور کوتوال چلے جاتے ہیں۔ چور سر جھکائے کھڑا ہے)

ممی آپ خواہ مخواہ نہلا رہی ہیں۔
کل میں پھر گندہ ہو جاؤں گا

افضل میاں: میاں معاف کرنا، تم کو بڑی تکلیف ہوئی۔ اب یہ سارے برتن تم لے جا سکتے ہو۔ میں نے تم کو دیئے۔ میری طرف سے تحفہ قبول کرو۔

چور: (افضل میاں کے پیروں پر روتا ہوا گر پڑتا ہے) مجھے معاف کر دیجئے میں واقعی چور ہوں۔ مجھے بڑی سے بڑی سزا بھی چوری سے باز نہ رکھ سکی۔ مجھے ہمیشہ گالیاں اور مار ہی ملی۔ لیکن آپ پہلے انسان ہیں جو مجھے چور جانتے ہوئے بھی مجھ سے ایسی محبت اور رحم کا برتاؤ کیا۔ اب میں آپ کے سامنے سچے دل سے چوری سے توبہ کرتا ہوں۔ میں آج سے نیک انسان بننے کی کوشش کروں گا اور محنت مزدوری کیا کروں گا۔

افضل میاں: اللہ تمہاری نیت میں پختگی دے —— یہ سارا سامان اب تمہارا ہے۔ اسے بیچ کر کوئی دھندا کرنا —— جاؤ —— خدا حافظ۔

(پردہ گرتا ہے) ★ ★

دوستو! نام ہے مرا ہاتھی
میں زمانے میں سب کا ہوں ساتھی

میری لمبائی اور چوڑائی
جس کی ہیبت ہر اک پہ ہے چھائی

پاؤں میرے ستون جیسے ہیں
بدنما اور بھدے بھدے ہیں

سونڈ سے پیڑ توڑ لیتا ہوں
اس سے ہر شے کو موڑ لیتا ہوں

دانت میرے بڑے نوکیلے ہیں
خوب صورت ہیں اور سجیلے ہیں

سیکڑوں اس سے کام بنتے ہیں
اس سے لاکھوں غریب پلتے ہیں

کچھ نرالے ہی طور ہیں میرے
دانت کھانے کے اور ہیں میرے

چھوٹی چھوٹی سی اپنی آنکھوں سے
دیکھ لیتا ہوں سب کو میلوں سے

سوپ کی طرح کان ہیں میرے
کوئی آہٹ ہو، ہیں یہ سن لیتے

میرا ماتھا توے کا جیسا ہے
جس پہ گیروے آرٹ بنتا ہے

سن کے رسّے کی طرح دُم ہے مری
کھینچ لو اس سے باندھ کر گاڑی

دوڑ میں سب کو مات دیتا ہوں
اچھے اچھوں کو لات دیتا ہوں

تیرنے میں مرا جواب نہیں
میری طاقت کا کچھ حساب نہیں

بھاری لٹھے بھی میں اُٹھاتا ہوں
کام کوئی ہو، کر دکھاتا ہوں

میں کہ بارش میں مست رہتا ہوں
اور پیپل کے پتّے کھاتا ہوں

تھوڑا کھاتا ہوں تیز چلتا ہوں
بادشاہوں کے گھر میں پلتا ہوں

میری چنگھاڑ تو سُنی ہوگی
سُن کے تم سب نے داد دی ہوگی

جسم موٹا ہے رنگ کالا ہے
اور تم سب کا دیکھا بھالا ہے

چار کھمبوں کی اِک عمارت ہوں
سارے بچّوں کی میں زیارت ہوں

ہر تماشے میں رنگ ہے میرا
واہ کیا خوب ڈھنگ ہے میرا

ہر شکاری کو ہے تلاش مری
ہر براتی کو ہے تلاش مری

میری فلموں میں بھی ضرورت ہے
ساری دُنیا میں میری عزّت ہے

جانور مجھ سے دھونس کھاتے ہیں
دیکھ کر مجھ کو بھاگ جاتے ہیں

خیر اب میری بات کو چھوڑو
کہنا جو چاہتا ہوں اُس کو سُنو

ہر بُرائی سے دور رہنا تم — ہر بھلائی پہ جان دینا تم
جو ہو بے شرم اور بے غیرت — اُس سے میری طرح کرو نفرت
بات مالک کی اپنے سنتا ہوں — اُس کا جو حکم ہو وہ کرتا ہوں
تم بھی اُستاد کی کرو عزت — تاکہ حاصل ہو علم کی دولت
رہ کے دُنیا میں مت غرور کرو — اور ہر آدمی سے جھک کے ملو
خود کو کمتر جہاں میں سمجھو تم — بات یہ میری طرح سوچو تم
تم بھی سچائی پر چلو۔ بچّو! — ہر بُرائی سے تم بچو۔ بچّو!
بات اپنے بڑوں کی مانو تم — دُکھ کسی کا ہو اپنا جانو تم
دھیان سے تم نے میری بات سُنی — ختم ہے اب مری نصیحت بھی
آؤ اب چٹکلہ سُناؤں تمہیں — اپنا اک راز ہے بتاؤں تمہیں

سب کو میں مار کر بھگاتا ہوں
پھر بھی چیونٹی سے ہار جاتا ہوں

ساجد صدیقی لکھنوی

عزت ذلت

عمر عادل

برسوں بعد میں اپنے وطن لوٹ رہا تھا۔ چار پانچ ہزار کی آبادی کی اس چھوٹی سی بستی میں میں نے سارا بچپن گزارا تھا۔ اس لئے وطن کی ہر گلی، ہر چیز کو دیکھنے اور لوگوں سے ملنے کے خیال ہی سے میرا دل خوشی سے بے قابو ہو رہا تھا۔ مجھے حامد صاحب بار بار یاد آ رہے تھے جنہوں نے مجھے مڈل اسکول تک پڑھایا تھا۔ اور ایک میں ہی کیا، بستی کا شاید کوئی بھی پڑھا لکھا آدمی ایسا نہیں ہوگا جس نے اسکول میں یا گھر پر اُن سے پڑھا نہ ہو۔ حامد صاحب کے ساتھ ہی مجھے عشرت خاں کی یاد بھی آتی رہی وہ بستی میں پہلے آدمی تھے جنہوں نے بستی میں فرنیچر کا کارخانہ قائم کیا تھا۔ اور بجلی سے چلنے والی آٹا پیسنے کی چکی لگوائی تھی۔ میں نے سُنا تھا کہ اب وہ اور بھی مال دار ہو گئے تھے۔

ٹرین سید پور کے چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی تو میں نے پلیٹ فارم اور اسٹیشن سے باہر سیکڑوں آدمی دیکھے جن میں سے بہت سوں

کے ہاتھوں میں ہار اور پھول تھے اور چہروں پہ خوشی کی چمک تھی۔ ٹرین کے رُکتے ہی وہ ایک کمپارٹمینٹ کی طرف اس طرح بڑھے جیسے سب ایک ساتھ سوار ہونا چاہتے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی شور ہونے لگا "وہ آگئے ــــ حامد میاں آگئے!"

لوگ کمپارٹمینٹ کی طرف ہار اور پھول اُچھالنے لگے۔ سب اس طرح خوش تھے جیسے اُن کے گھر کا کوئی بہت عزیز فرد برسوں بعد آیا ہے۔ ہر شخص حامد صاحب کو دیکھنے کے لئے بے چین تھا۔

حامد صاحب حج سے واپس آرہے تھے ــــ مجھے یہ جان کر دکھ ہوا کہ ہم نے ایک ہی ٹرین میں رات بھر سفر کیا مگر مجھے پتہ ہی نہیں چلا، ورنہ اُن سے مل لیتا۔ اب اس بھیڑ میں ان سے ملنا تو دور کی بات تھی انہیں ایک نظر دیکھنا بھی مشکل تھا۔

اسٹیشن کے باہر ایک بڑی سی عمارت کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ جب میں سیدپور میں رہتا تھا تو یہ عمارت نہیں تھی۔ ان دنوں دکانیں بھی نہیں تھیں۔ اسٹیشن بالکل ویران نظر آتا تھا۔

"یہ عمارت کس کی ہے؟" میں نے ایک آدمی سے پوچھا۔

"یہ مسافر خانہ ہے ــــ عشرت ڈکیت نے بنوایا ہے۔" وہ آدمی بولا اور پھر پھولوں کے ہار اُچھالنے لگا۔ ایک آدمی سے پوچھا تو وہ بولا "یہ پیاؤ عشرت ڈکیت نے بنوایا ہے۔"

میں رکشا میں بیٹھ کر چلا تو میرے پوچھنے پر رکشا والا بولا "یہ سڑک یہاں سے عیدگاہ تک پکی ہوگئی ہے ــــ عشرت ڈکیت نے بنوائی ہے۔ اور پھر وہ راستے بھر بولتا رہا "یہ دیکھئے، عیدگاہ کو بھی عشرت ڈکیت نے پکا کرادیا ہے۔ یہ ہسپتال بھی اسی نے بنوایا ہے ــــ پہلے اسکول کی عمارت خراب اور چھوٹی سی تھی اب عشرت ڈکیت نے کتنی شاندار بنوادی ہے۔ وہی اب اس کا منیجر بھی ہے۔"

"بھئی یہ عشرت ڈکیت کون ہے؟" میں نے وہ سوال پوچھ ہی لیا جو دیر سے ذہن میں تھا۔

"آپ عشرت ڈکیت کو نہیں جانتے؟ وہ تو دُور دُور مشہور ہیں ــــ ارے جناب وہی جن کا فرنیچر کا کارخانہ بھی ہے۔"

"اچھا وہ! مگر تم عشرت خاں صاحب کو ڈکیت کیوں کہہ رہے ہو؟" میں نے بُرا مان کر کہا۔

لیکن مجھ سے زیادہ شاید رکشا والے نے میری بات کا بُرا مانا بولا "میں ہی کیا، انہیں تو سب عشرت ڈکیت کہتے ہیں اور ۔ ۔ ۔ ۔" یہ کہتے کہتے رکشا والا رکا اور پھر دور سڑک پہ کھڑی ہوئی ایک کار کی طرف اشارہ کرکے بولا۔ "وہ ــــ وہ کار کے پاس کھڑا ہے کالا سوٹ پہنے۔ شاید کار خراب ہوگئی۔"

پھر کار کے قریب پہنچ کر رکشا والا نیچے اُتر کر پیدل رکشا چلاتے ہوئے کار کے پاس سے گزرنے لگا تو کالے سوٹ میں کھڑے ہوئے عشرت صاحب کو اُس نے جھک کر سلام کیا اور پھر آگے نکل کر رکشا پر سوار ہوگیا۔

گھر پہنچ کر جب میں نے رکشا والے کی باتیں بیان کیں تو بوڑھی خادمہ بولی "میاں، وہ ٹھیک کہتا تھا انہیں تو سب عشرت ڈکیت ہی کہتے ہیں۔" پھر اُس نے مجھ سے پوچھا "بیٹا، اسی گاڑی سے آج حامد میاں بھی تو آنے والے تھے؟" جب میں نے اُسے بتایا کہ وہ آگئے ہیں تو وہ بولی "اللہ کا شکر ہے ــــ اُن کے بغیر تو پوری بستی سُونی سُونی لگتی تھی۔"

شام کو میں گھر سے نکلا تو جو شخص بھی ملا حامد صاحب کا ذکر کرتا ملا۔ ہر ایک کی زبان پر اُن کی تعریف تھی۔ کوئی اُن کی

ایمان داری کا متوالا تھا، تو کوئی سچائی کا، کوئی اُن کی محبت اور ہمدردی کی کہانی سُنا رہا تھا تو کوئی اُن کی عبادت گزاری کا ذکر کر رہا تھا۔

دو تین مرتبہ میں حامد صاحب سے ملنے گیا لیکن ہر بار یہی معلوم ہوا کہ کسی کے یہاں دعوت میں گئے ہیں۔ آخر ایک شام ان سے ملاقات ہو ہی گئی۔ اس وقت بھی انہیں فرصت نہیں تھی۔ لوگ برابر اُن سے ملنے آ رہے تھے اور طرح طرح سے اُن کی تعریف کرتے ہوئے جا رہے تھے ـــــ حامد صاحب تھے بھی ایسے ہی ـــــ اتنا نرم اور محبت سے بھرا ہوا لہجہ جیسے بات نہ کر رہے ہوں پُچکار رہے ہوں ـــــ یہ لہجہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ میں نے دیکھا اُن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ پہلے ہی کی طرح آج بھی وہ ہر ایک سے محبت ہمدردی اور خلوص رکھتے تھے۔ آج بھی وہ ہر ایک کے دکھ سکھ میں شریک رہتے تھے، چاہے امیر ہو یا غریب، ہندو ہو یا مسلمان۔ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے جب انہوں نے کہا "بیٹے میرے پاس تو صرف علم اور محبت کی دولت ہے جو میں لوگوں میں ہمیشہ بانٹتا رہا اور مرتے دم تک بانٹتا رہوں گا۔ کسی کو میری ذات سے خوشی مل جائے اس سے زیادہ خوشی کی میرے لئے دوسری کوئی بات نہیں۔" مجھے یاد آیا یہی بات وہ پہلے بھی اکثر کیا کرتے تھے۔

حامد صاحب کے یہاں سے اُٹھ کر میں عشرت صاحب سے ملنے گیا تو حویلی کی جگہ ایک عالی شان کوٹھی دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ کہیں میں غلط جگہ تو نہیں آ گیا۔ میں نے ایک راہ گیر سے پوچھا تو بولا، "ہاں جی، عشرت ڈکیت کا یہی گھر ہے۔" اُس کے جواب پر میں ایک مرتبہ پھر چونک پڑا۔

کوٹھی میں عشرت صاحب کرسیوں پر اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے باتیں کر رہے تھے۔ لوگ اُن کی نیکی اور بھلائی کے کاموں کی تعریفیں کر رہے تھے۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر زمین پر کچھ لوگ لائن میں بیٹھے تھے جنہیں کمبل بانٹے جا رہے تھے۔ میرے ساتھ باتیں کرتے ہوئے عشرت صاحب نے بتایا کہ وہ ہر سال بستی کے غریبوں کو مفت کمبل بانٹتے ہیں اور پھر وہ درگاہ اسکول، مسافر خانہ، ہسپتال اور جانے کن کن چیزوں کا ذکر کرتے رہے جو انہوں نے بستی میں بنوائی تھیں۔

جب میں کوٹھی سے باہر آیا تو ایک شخص نے مجھے روک کر آہستہ سے پوچھا "کیا مال ہے؟"

"کیسا مال؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"افیم، گانجا وغیرہ؟" وہ شخص بولا

"کیا مطلب؟" میں نے ناگواری سے پوچھا۔

"معاف کیجئے گا۔ میں سمجھا آپ عشرت ڈکیت کے کوئی ایجنٹ ہیں ـــــ کیا خفیہ پولیس والے ہیں؟"

"نہیں بھائی ـــــ نہ میں ایجنٹ ہوں نہ سی آئی ڈی کا آدمی ہوں۔ آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"معاف کرنا۔ بُرا ماننے کی بات نہیں اس کوٹھی میں سٹّہ ہوتا ہے جس پر چھاپے پڑتے ہیں اور لُٹنے والی چیزوں کی چوری چھپے خرید فروخت ہوتی ہے ـــــ آپ نئے نئے نظر آئے تو میں غلط فہمی میں پڑ گیا۔ اس شخص نے کہا اور پھر عشرت صاحب کے بارے میں جانے کیا کیا بتاتا رہا کہ انہوں نے کس کس کی زمین اور مکان پر ناجائز قبضہ کیا۔

وہ کہتا رہا اور میں سوچتا رہا ـــــ اللہ پاک سچ کہتا ہے کہ جسے وہ چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت دے۔ اگر عزت اور ذلت، اچھے اور بُرے عمل کی بجائے، دولت یا غریبی کی وجہ سے ہوتی تو لوگ نہ حامد صاحب کے شیدائی ہوتے، نہ عشرت صاحب کو عشرت ڈکیت کہہ کر یاد کرتے۔ ●●

"ڈیڈی ہمارا ٹامی اپنا کھانا لے کر
آیا ہے اور آپ کو چکھانا چاہتا ہے۔"
"بھونکنے کی ضرورت نہیں،
مجھے بلانا ہو تو دروازہ پہ
شریفوں کی طرح
دستک دیا کرو۔"
"جناب یہ ہمارے کتے کی کرسی ہے آپ
غلطی سے اس پر بیٹھ گئے ہیں۔"
"تمھیں گانے کے لیے کس نے کہا ہے۔۔؟"
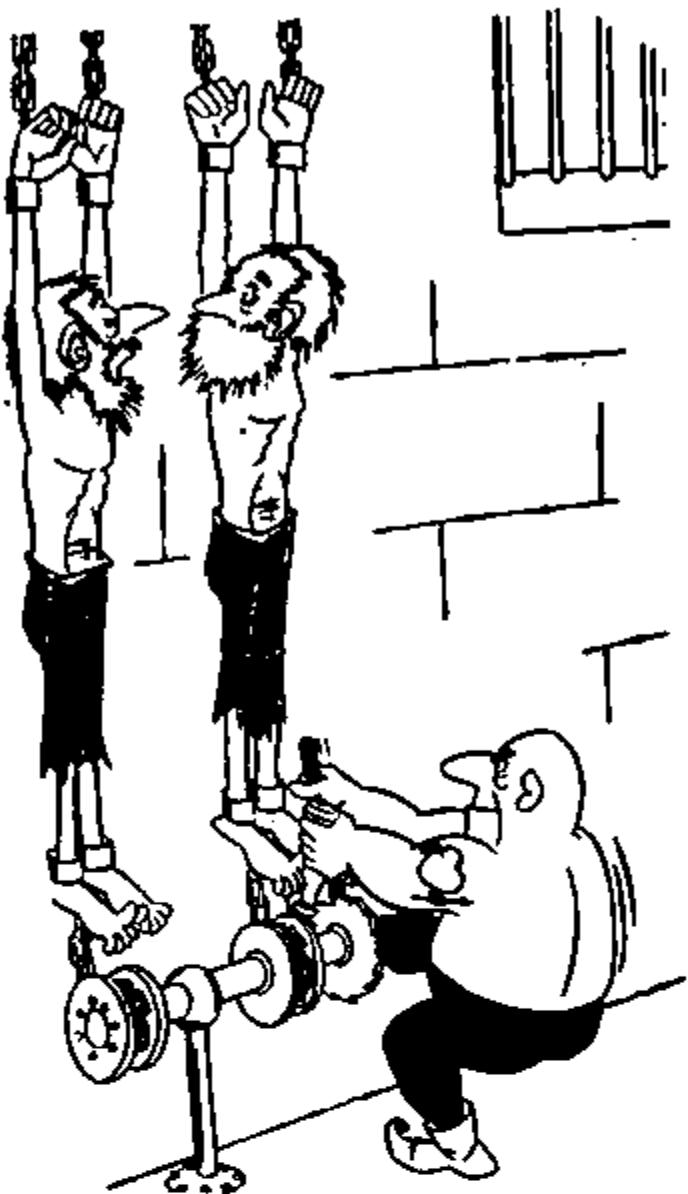
(صفحہ ۱۴ سے آگے)

نہیں چلا تو سچ بولا۔ سچ بولنے پر پٹائی کی گئی۔ پٹائی کے بعد ماں جی رونے لگیں۔ گلے سے لگا کر بولیں :

"اگر تم ڈوب جاتے تو ـــــ؟" اس وقت ہمیں ماں جی کی گود میں وہی مزا آیا جو اپنے آپ کو دریا کی لہروں کے سپرد کرنے میں آیا تھا۔

پانچ چھ دن کے بعد گھٹنے ٹھیک ہو گئے۔ پھر وہی ڈونگس کی باؤلی، مگر ماں جی نے اس بار ایک نوکر ساتھ کر دیا۔ اور اسے ہدایت کر دی کہ ہمیں دریا نہ جانے دے۔

مگر وہ نوکر بھی کم بخت لڑکا سا تھا۔ اسے بھی ہماری طرح دریا میں نہانے کا شوق تھا۔

پھر نہاتے۔ پھر نہاتے۔ کئی بار گھٹنے چھلے۔ مگر دھیرے دھیرے دریا میں نہانا آ گیا۔

"یہاں آنے کے بعد سے میرا قد جلدی جلدی بڑھنے لگا ہے"

سکول میں ورزش کرانے والے پی۔ ٹی کے ایک ماسٹر جی تھے۔ جسم بہت گٹھا ہوا تھا۔ گال سُرخ، مگر قد بہت چھوٹا تھا۔ اس پر ایک کمزوری یہ تھی کہ ورزش کراتے کراتے سو جاتے تھے۔

ایک دفعہ کیا ہوا، ہماری کلاس پریڈ کر رہی تھی ـــ

پی۔ ٹی ماسٹر جی نے کہا۔

"لنج فارورڈ LUNGE-FORWARD"

ساری کلاس نے لائن میں کھڑے ہو کر ایک ہاتھ آگے کو بڑھا دیا۔ ایک پاؤں اوپر اٹھایا۔ اور اب اس حالت میں کھڑے ہیں، اور اُمید کر رہے ہیں کہ ماسٹر جی پریڈ کا رُخ بدلیں ـــــ

مگر ماسٹر جی تو سو رہے ہیں۔ حکم دے کر کھڑے کھڑے سو رہے ہیں۔ اور ہم سب لڑکے ایک ہاتھ آگے بڑھائے دوسری ٹانگ اوپر اٹھائے چُپ چاپ کھڑے کھڑے تھکے جا رہے ہیں۔

آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ ماسٹر جی کا چھوٹا سا قد۔ لال چہرہ۔ جھکا ہوا سر اور سر کے اوپر اُٹھے ہوئے بال دیکھ کر مجھے گلیوں میں گھومنے والا مُرغا یاد آ گیا۔ میں نے زور سے آواز لگائی۔

"ککڑوں کوں!"

ماسٹر جی ایک دم چونک کر جاگے۔ ساری کلاس ہنس پڑی۔

"کس نے ککڑوں کوں کہا" ماسٹر جی زور سے گرجے۔

خیر میری پٹائی جو ہوئی سو ہوئی، مگر اس دن سے پی ٹی ماسٹر جی کا نام مُرغا ماسٹر پڑ گیا۔

جدھر سے گزرتے، لڑکے چھپ

کر زور سے چلاتے
"دگگڑوں کوں!"

جب سکول میں اور ذرا بڑے ہوئے یعنی جب لکھنے پڑھنے کی سمجھ آئی، تو ایک دن نئی شرارت سوجھی۔ ہیڈ ماسٹر جی کا سالا عبداللہ اُس کا نام تھا۔ ہمارا گہرا دوست تھا۔ سکول دو منزلہ تھا۔ نیچے کی پھیلی ہوئی منزل میں ہائی سکول تھا۔۔۔ اوپر کی آدھی منزل میں ہیڈ ماسٹر صاحب کا گھر تھا۔ سکول میں آنے جانے کے لئے لڑکوں کے لئے نچلی منزل پر ایک بڑا پھاٹک تھا، جس پر ہمیشہ چوکیدار کا پہرہ رہتا تھا۔ اوپر کی منزل کو جانے کے لئے ایک سیڑھیوں والا دروازہ الگ سے تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر سے سکول کے اندر جانے کے لئے ہیڈ ماسٹر صاحب کے لئے ایک سیڑھی والا رستہ اور بھی تھا۔

یہ دروازہ اُن کے گھر سے اُن کے آفس تک جاتا تھا۔ چھٹی کے دن یہ دروازہ بند رہتا۔ آفس کا بھی۔ اور گھر سے آفس جانے کا کوریڈور بھی۔ باہر کا پھاٹک بھی بند تھا اور سکول کے باہر چوکیدار کا پہرہ تھا۔ جب ہیڈ ماسٹر صاحب گھر سے کہیں باہر جاتے۔ میں اور عبداللہ اوپر چھت پر جا کر پتنگ اڑاتے یا بنٹے کھیلتے۔ کبھی کبھی عبداللہ اپنی بہن سے نظر بچا کے کوریڈور کی چابی مانگ لیتا۔ اور ہم لوگ ہیڈ ماسٹر کے آفس کے باہر جا کر باغیچے میں بیٹھ جاتے اور باغیچے کا فوارہ چلا کر اس کا تماشہ دیکھتے۔

جغرافیہ پڑھانے والے ماسٹر جی کی آواز بڑی کڑوی کسیلی تھی۔ لگتا تھا روز کونین کی گولی نگل کر آتے ہیں۔ مگر ان میں دو تین کمزوریاں تھیں ایک تو وہ جن لڑکوں کی

پرائیویٹ ٹیوشن لیتے تھے، ان پر خاص توجہ کرتے تھے۔ دوسرے ہم دونوں کو کبھی نہیں پیٹتے تھے۔ ایک مجھے کہ میں ڈاکٹر کا لڑکا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب ہر ہفتے، ایک دفعہ ضرور سکول کے بچوں کا معائنہ کرنے آتے تھے۔ دوسرے وہ عبداللہ کو کبھی نہیں پیٹتے تھے۔ کیوں کہ عبداللہ سکول کے ہیڈ ماسٹر کا سالا تھا۔

ایک روز میں نے اور عبداللہ نے آپس میں صلاح کی۔
"بھئی۔ بہت بُری بات ہے۔ یہ کم بخت ہمیں پیٹتا ہی نہیں۔"
"ہاں!" عبداللہ بولا "لڑکوں میں تو بڑی ہیٹی ہو رہی ہے ہماری! سب ہی انگلی اُٹھانے لگے ہیں۔ کہتے ہیں تُو سالا۔۔۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کا سالا ہے۔ دوسرا ڈاکٹر کا بیٹا ہے۔"

اگر جغرافیہ والے ماسٹر جی نے ہمیں نہ پیٹا تو سخت بے عزتی ہو جائے گی لڑکوں میں۔ طے کیا گیا کہ اگلے دن جغرافیہ والی کلاس میں ماسٹر جی جو سوال پوچھیں گے اس کا غلط جواب دیا جائے گا۔ اور ماسٹر جی سے پٹائی حاصل کر کے لڑکوں میں سرخروئی حاصل کی جائے گی۔

دوسرے دن ماسٹر جی نے افریقہ کا نقشہ سمجھاتے ہوئے پوچھا "ٹمبکٹو کہاں ہے؟"
میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا "سر وہ چھٹی پر گیا ہے، اس کی ماں بیمار ہے۔"
ساری کلاس ہنس پڑی۔
ماسٹر جی کو غصہ تو بہت آیا، مگر پی گئے۔ اس پر عبداللہ نے ہاتھ اٹھایا۔
"یہ غلط کہتا ہے ماسٹر جی۔ ٹمبکٹو ایک قسم کا گدھا ہوتا ہے۔ افریقہ کے جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔"

ماسٹر جی ہنس کر ٹال گئے۔ بولے "اچھے بچے شرارت نہیں کرتے۔ ذرا اس نقشے کی طرف دھیان دو۔ ٹمبکٹو شہر یہاں واقع ہے"

ہم دونوں کے چہرے اُتر گئے۔

دوسرے دِن اتوار تھا۔ میں نے عبداللہ سے کہا: "اس کم بخت نے آج بھی نہیں پیٹا ــــ اس ماسٹر جی کی خبر لینی چاہیئے"

"مگر کیسے؟"

میں نے کہا "ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے۔ اس ماسٹر جی کے خلاف ایک اشتہار لکھ کر ہیڈ ماسٹر جی کے آفس کے باہر چپکا دینا چاہیئے"

عبداللہ نے تالی بجائی۔

میں نے اشتہار لکھا۔ شاید ادب کے میدان میں یہ میرا پہلا قدم تھا۔ عبداللہ گوند لے آیا۔ پھر اپنی بہن کے کمرے سے چپکے سے چابی لے آیا۔ ہم نے خاموشی سے یہ اشتہار ہیڈ ماسٹر کے آفس کے باہر چپکا دیا۔

اس دن اتوار تھا۔ دوسرے دِن جب سکول کھلا۔ تو سب ہی دھک سے رہ گئے۔ نہ صرف ماسٹر جی بلکہ سکول کے لڑکے بھی غول کے غول آ کے وہ اشتہار پڑھتے اور خوشی سے تالی بجاتے۔ اس اشتہار میں جغرافیہ والے ماسٹر جی کی خاصی کھلّی اُڑائی گئی تھی۔ کِسی کا شبہ ہم پر نہ گیا کیونکہ اشتہار میں خاص طور پر اس امر پر زور دیا گیا تھا۔ کہ جغرافیہ والے ماسٹر جی خاص طور پر طرف داری کرتے ہیں۔ اور ڈاکٹر کے بیٹے۔ اور ہیڈ ماسٹر کے سالے اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے لڑکے کو کبھی نہیں پیٹتے۔

دوسرے ماسٹر صاحبان نے مزے لے لے کر اس اشتہار کو پڑھا۔

حساب کے ماسٹر جی نے خاص طور پر خوش ہو کر کہا۔ "شُکر ہے کسی نے میرے خلاف کچھ نہیں لکھا"

اس پر میں نے اور عبداللہ نے ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا۔

اگلے سوموار کو حساب والے ماسٹر جی کے خلاف ایک لمبا چوڑا اشتہار لگا تھا۔ پھر تو ہماری ہمت بندھ گئی۔ ہر اتوار کو نئے اشتہار کا مسودہ تیار ہوتا اور مختلف ماسٹروں کی "ناانصافیوں" کے تذکرے تیار کر کے چپکا دیتے جاتے۔ سارے سکول میں کھلبلی مچ گئی۔ کِسی کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اشتہار کون لگاتا ہے۔ اور کیسے؟ دِن بھر سکول کھلا رہتا ہے۔ رات کو پھاٹک باہر سے بند ہوتا ہے۔ چوکیدار کا پہرہ ہوتا ہے۔ اوپر کی منزل میں ہیڈ ماسٹر صاحب خود نگرانی کرتے ہیں۔ پھر بھی ہر سوموار کو ایک نیا اشتہار موجود رہتا ہے۔

ایک روز عبداللہ کی بہن نے مجھے اور عبداللہ کو اشتہار لگاتے ہوئے پکڑ لیا۔ دوسرے دِن سکول کے پانچ سو لڑکوں کے سامنے کھڑا کر کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہم دونوں کی دُھنائی کی ....

اشتہار اب بھی میں روز لگاتا ہوں۔ پہلے ماسٹروں کے خلاف۔ آج سماج کے خِلاف۔ دُھنائی بھی ہوتی ہے۔ مگر مزا آتا ہے۔ میں وہی بچّہ ہوں، بالکل نہیں بدلہ ■ ■

پورا گھر آپ کے ہاتھ میں

- نئے **بانو** کا ۱۹۷۳ کا سال نامہ جب مارچ میں آپ کے پاس ہوگا تو یوں سمجھ لیجیے کہ پورا گھر کا گھر آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔
- گھریلو زندگی سلیقے سے گزارنا بھی ایک بہت بڑا فن ہے جس کے تمام راز **بانو** کے سال نامہ ۱۹۷۳ میں آپ کو ملیں گے۔
- آپ کے جذباتی اور نفسیاتی مسائل کا بھرپور تجزیہ کرنے والا، اور اس کے علاوہ آپ کے گھر، آپ کی گھریلو زندگی، اور خود آپ کے حسن میں چار چاند لگانے والا نیا **بانو** اصلاحی اور حقیقت پسندانہ نظریہ کا علمبردار ہے، جس کے سال نامہ ۱۹۷۳ کو سجانے سنوارنے میں ملک کے تقریباً تمام مایۂ ناز ادیب حصہ لے رہے ہیں۔
- جلد ہی گیارہ روپے سالانہ قیمت (جس میں ایک روپیہ سال نامہ رجسٹری سے بھیجنے کا خرچ بھی شامل ہے) ارسال فرمادیجیے تاکہ **چار روپے** کی قیمت کا یہ خزانہ آپ **مفت** حاصل کرسکیں اور اس کے بعد آنے والے گیارہ شمارے بھی آپ کے گھر کو جنت بنانے میں آپ کی مدد کرسکیں۔

ماہنامہ **بانو** آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

خاموشی کی زبان

اظہار اثر

جاوید دسویں کلاس کے امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ وہ الجبرے کے ایک سوال میں الجھا ہوا تھا۔ آدھے گھنٹے کی کوشش کے بعد بھی وہ سوال حل نہ کر سکا تو اپنے ڈیڈی سے پوچھنے کے لئے ان کے کمرے میں داخل ہوا۔

جاوید کے ڈیڈی سی۔آئی۔ڈی انسپکٹر تھے اور اپنی پندرہ سال کی ملازمت کے دوران بڑے بڑے چالاک مجرموں کو گرفتار کر چکے تھے، بلکہ کئی بار مجرم کو گرفتار کرانے میں خود جاوید نے بھی ان کی مدد کی تھی۔

کیا تم بتا سکتے ہو ان میں مکھیوں کی رانی کون سی ہے؟

جاوید کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ انسپکٹر پرویز کمرے میں ادھر اُدھر ٹہل رہے ہیں۔ میز پر ایش ٹرے میں سگرٹوں کے ٹکڑوں کا ڈھیر تھا۔ ان کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اور ان کی آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ذہنی طور پر سخت پریشان ہیں۔ وہ اپنے خیالات میں اس قدر الجھے ہوئے تھے کہ جاوید کے کمرے میں داخل ہونے کی آہٹ بھی انہوں نے نہ سنی۔

جاوید چپ کھڑا اپنے ڈیڈی کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ اپنی دُھن میں سر جھکائے کمرے میں ٹہلے جا رہے تھے، اور سگرٹ کے کش لگائے جا رہے تھے۔

آخر کچھ دیر کے بعد جاوید نے کہا "ڈیڈی!"

آواز سن کر وہ چونکے۔ انہوں نے جاوید کی جانب دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے "آؤ جاوید ـــــ کیا بات ہے؟"

"میں الجبرے کا ایک سوال پوچھنے آیا تھا ڈیڈی۔ لیکن میرا سوال بعد میں ہو سکتا ہے۔ پہلے آپ یہ بتائیے کہ آپ کیوں پریشان ہیں۔ کیا آج کل کوئی کیس آپ کے ہاتھ میں ہے؟"

وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے جاوید کو دیکھتے رہے۔ پھر سر ہلاتے ہوئے بولے "ہاں بیٹا۔ آج کل میں ایک عجیب و غریب کیس میں اُلجھا ہوا ہوں۔"

"ذرا مجھے بھی کچھ بتائیے۔"

وہ پھر کچھ دیر سوچ کر بولے۔

"میں خود تمہیں بتا کر مشورہ کرنا چاہتا تھا بیٹے، کیوں کہ تم نے کئی پُراسرار کیسوں میں میری مدد کی ہے۔ مگر اس کیس میں اُلجھن یہ ہے کہ یہ غیر ملکی جاسوسوں کا معاملہ ہے اور حکومت کے بہت سے رازوں کا اس کیس سے تعلق ہے۔"

"آپ مجھے کوئی راز نہ بتائیے۔ صرف اپنی اُلجھن بتا دیجئے۔ اور آپ جانتے ہیں اب میں بالکل بچہ نہیں رہا ہوں۔ آپ کی ذمہ داریوں کو خوب سمجھتا ہوں۔"

"او۔ کے جاوید۔" انسپکٹر پرویز نے مسکرا کر کہا "میں تمہیں اپنی اُلجھن بتاتا ہوں۔ ابھی تین ہفتے پہلے ملٹری سیکرٹ سروس کے چیف جنرل دیال نے مجھے بلایا تھا۔"

جاوید نے بات کاٹ کر کہا "لیکن ڈیڈی، ملٹری سیکرٹ سروس تو خود جاسوسوں کا محکمہ ہے۔"

"درست ہے ـــــ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود ڈاکٹر اپنا علاج نہیں کر پاتا۔ اس لئے دوسرے ڈاکٹروں سے علاج کراتا ہے۔ بالکل یہی بات جنرل دیال کے ساتھ پیش آئی ہے۔ ان کو شک ہے کہ ان کی سکریٹری مس ایلا غیر ملکی جاسوس ہے اور گورنمنٹ کے راز اپنے ایک ساتھی کی مدد سے کسی دوسری حکومت کو بھیج رہی ہے۔"

"یہ شک انہیں کیوں ہوا؟"

"یہ شک ہی نہیں، بلکہ انہیں یقین ہو چکا ہے کہ ایلا جاسوس ہے۔ اب سے پانچ چھ ماہ پہلے وائرلیس محکمہ نے کچھ "کوڈ" پیغامات سنے تھے جو ہندوستان سے بھیجے جا رہے تھے۔ وائرلیس محکمے نے آلات

کے ذریعہ پتہ چلا لیا کہ وہ پیغامات مارٹن روڈ کے ایک مکان سے بھیجے جا رہے ہیں۔ اس مکان میں ٹھاکر نام کا ایک ادھیڑ عمر شخص رہتا ہے۔ کئی مہینے کی کوششوں کے بعد آخر سیکرٹ سروس کے کوڈ حل کرنے والوں نے ان پیغامات کو سمجھنے کا راز معلوم کر لیا۔ جب وہ پیغامات سادہ زبان میں سمجھے جانے لگے تو پتہ چلا کہ ان میں سیکرٹ سروس کے بہت اہم راز دوسرے ملک کو بھیجے جاتے ہیں۔ ان میں سے کئی راز ایسے تھے جو صرف جنرل دیال کو معلوم تھے یا ان کی سکریٹری ایلا کو۔ چناں چہ ایلا پر شبہ کیا جانا لازمی بات تھی۔ یہ راز معلوم ہونے کے بعد سیکرٹ سروس کے دو تجربہ کار جاسوس ایلا کی نگرانی پر لگا دیئے گئے اسی طرح دو جاسوس اس شخص ٹھاکر کی نگرانی کر رہے ہیں۔ جنرل دیال کو یقین تھا کہ ایلا ہی کسی طرح ٹھاکر کو حکومت کے راز پہنچاتی ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ کئی ماہ کی نگرانی کے باوجود یہ جاسوس یہ بات نہیں ثابت کر سکے ایلا اور ٹھاکر اس عرصے میں ایک بار بھی کبھی ایک دوسرے سے ملے ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں۔"

جاوید نے بات کاٹ کر سوال کیا "اور اس دوران میں وہ پراسرار پیغامات بھیجے جاتے رہے ہیں؟"

"ہاں" انسپکٹر نے سر ہلایا۔ "اور ان پیغامات میں وہی محکمے کے راز بھیجے گئے ہیں جو جنرل تجربے کے طور پر صرف ایلا کو بتاتے رہے ہیں۔"

"پھر تو واقعی حیرت کی بات ہے۔ جب وہ ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں تو ایلا اس کو راز کس طرح پہنچاتی ہے ——— کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ بھی وائرلیس قسم کے آلے سے ٹھاکر کو راز بتاتی ہو؟"

"نہیں ——— وائرلیس کی لہروں کو چیک کرنا آج کل آسان کام ہے۔ اس کے علاوہ جاسوسوں نے ان دونوں کی لاعلمی میں دونوں کے مکان اور سامان کی بھی تلاشی لے لی ہے۔ ٹھاکر کے مکان میں ایک بہت اچھا وائرلیس موجود ہے۔ لیکن ایلا کے مکان میں کچھ نہیں البتہ اس تحقیق کے دوران میں ایک ایسی بات کا پتہ چلا ہے جس

معاف کرنا شاید پہلے ہم کہیں
ملے ہیں۔ عینک نہ ہونے کی
وجہ سے میں پہچان نہیں سکا۔

سے شک ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"

"وہ کیا بات ہے؟"

"ہر جمعہ کو دفتر سے اٹھنے کے بعد ایلا اپنے دفتر کے نوجوان ساتھیو کے ساتھ بلو اسکائی ریسٹوران میں جاتی ہے، اور چند گھنٹے اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں گزارتی ہے ان چند لوگوں کے لئے جمعہ کے دن ریسٹوران میں ایک ٹیبل ریزرو رہتی ہے ایلا اپنے ساتھیوں کے ساتھ تقریباً ساڑھے پانچ بجے وہاں پہنچتی ہے۔ ٹھیک چھ بجے اسی ریسٹوران میں ٹھاکر داخل ہوتا ہے اور وہ عموماً کافی کاؤنٹر پر بیٹھتا ہے۔ اس کی پیٹھ ہمیشہ ایلا کی جانب رہتی ہے۔ البتہ کاؤنٹر پر جو شیشہ لگا ہے اس میں سے وہ ایلا کو دیکھ سکتا ہے۔ وہ آدھا گھنٹہ یا ایک گھنٹہ کاؤنٹر پر ہی بیٹھا کافی پیتا رہتا ہے۔ پھر اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ ایلا اور اس کے ساتھی بعد میں جاتے ہیں۔ اس دوران میں وہ نہ کوئی اشارہ کرتے ہیں، نہ ایک دوسرے کی جانب دیکھتے ہیں۔ اگر وہ دونوں واقعی ساتھی ہیں تو پھر ایلا اس کو وہ راز کس طرح بتاتی ہے؟"

"پھر تو یہ بہت آسان بات ہے۔" جاوید نے کہا۔

"وہ کیسے؟"

"ہزار طریقے ہیں۔ وہ بیرے کے ذریعہ کاغذ کے پرزے پر پیغام

ایک کان سے بات سن کر
دوسرے سے نکالنے کی تیاری

لکھ کر بھیج سکتی ہے۔"

"نہیں۔" انسپکٹر نے سر ہلا کر کہا "تین ہفتوں سے ہر جمعہ کو میں خود ریسٹوران میں جا کر چیک کر چکا ہوں۔ وہ کسی بیرے کے ذریعہ کوئی پیغام نہیں بھیج سکتی، کیوں کہ وہ میز کے کونے والی کرسی پر بیٹھتی ہے۔ بیرا اس سے دُور رہتا ہے۔ بیچ میں اس کے دفتر کے ساتھی ہوتے ہیں۔ وہ سگریٹ بھی پیتی ہے، بلکہ یہ کہو کہ بہت پیتی ہے۔ ہم نے احتیاطاً اس کے سگریٹوں کے بچے ہوئے ٹکڑے بھی لیباریٹری میں چیک کرائے ہیں۔ ان پر بھی کچھ نہیں لکھا ہوتا۔"

"پھر وہ انگلیوں سے گونگے بہروں کی زبان میں سگنل دے سکتی ہے، جن کو ٹھاکر شیشے میں دیکھ سکتا ہے۔"

"اس کے ہاتھ ہمیشہ میز پر رکھے رہتے ہیں۔ صرف سگریٹ یا کافی پینے کے لئے اس کا ہاتھ مونہہ تک آتا ہے۔ نہیں جاوید میاں، میں ہر طرح چیک کر چکا ہوں۔ انگلیوں کے اشارے، آنکھوں کے اشارے ہونٹوں کے اشارے ——— وہ کچھ نہیں کرتی۔ بلکہ اس دوران میں اپنے ساتھیوں سے باتوں میں مصروف رہتی ہے۔ قہقہے لگاتی رہتی ہے۔ کافی پیتی رہتی ہے اور سگریٹ پھونکتی رہتی ہے ——— کوئی مشکوک حرکت نہیں کرتی۔ تین ہفتے سے میں اس کی ایک ایک حرکت چیک کرتا آیا ہوں۔ بلکہ ایک بار میں اس کے ساتھ ان کی ٹیبل پر بھی بیٹھ چکا ہوں تاکہ قریب سے اسے دیکھ سکوں۔ اس کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ٹھاکر کو کس طرح پیغام بھیجتی ہے۔ دوسری دل چسپ بات یہ ہے کہ صرف جمعہ کی رات کو ہی ٹھاکر وہ پیغام وائرلیس سے بھیجتا ہے ——— باقی دنوں میں کوئی پیغام نہیں جاتا۔ اس سے یہ بات اور پکی ہو جاتی ہے کہ جمعہ کے دن ریسٹوران میں ہی ایلا اس کو کسی طرح راز بتاتی ہے۔"

"پھر تو وہ یقیناً جادوگرنی ہوگی، ڈیڈی۔"

"جادو کوئی چیز نہیں ہے بیٹا۔ تم تو خود جانتے ہو۔ کیوں کہ تم سائنس کے اسٹوڈنٹ ہو۔"

"آپ اس کی ٹیبل پر کب بیٹھے تھے؟"

"ابھی پچھلے جمعہ کو۔"

"آپ نے اس سے باتیں بھی کی تھیں؟"

"ہاں ——— وہ بڑی دل چسپ باتیں کرتی ہے۔ البتہ جس تیزی سے وہ سگرٹ پیتی ہے، اس سے وہ نروس معلوم ہوتی ہے، جیسے کسی ذہنی اُلجھن میں گرفتار ہو ——— میں نے اس سے کہا کہ وہ بہت زیادہ سگرٹ پیتی ہے تو اس نے بتایا کہ دفتر میں سگرٹ پینا منع ہے، اس لئے وہ دفتر سے چھٹی ہوتے ہی آٹھ دس سگرٹ مسلسل پی کر اپنی طلب بجھا لیتی ہے۔"

جاوید کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا "آج پھر جمعہ ہے، ڈیڈی۔"

"اسی لئے تو میں آج زیادہ پریشان ہوں ——— جنرل دیال یہ چاہتے ہیں کہ جب تک یہ راز نہ معلوم ہو کہ ایلا کس طرح راز ٹھاکر کو دیتی ہے اس وقت تک دونوں کو گرفتار نہ کیا جائے ——— اگر میں یہ راز معلوم کرنے میں ناکام رہا تو ہوگا تو کچھ نہیں، لیکن میرے ذہن میں اس ناکامی کی کھٹک ہمیشہ رہے گی۔"

"کیا آپ آج بھی ریسٹوران میں جائیں گے۔"

"ہاں۔"

"تو مجھے بھی ساتھ لے لیجئے ——— میں بھی اس جادوگر جاسوسہ کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا، شام کو تم بھی چلنا ——— اب لاؤ تمہارا سوال دیکھوں کیا ہے۔"

"بس اب سوال بھی میں ریسٹوران سے واپس آنے کے بعد ہی دریافت کروں گا، ڈیڈی۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے میں اس عورت کو ایک نظر دیکھ کر وہ خیال آپ کو بتاؤں گا۔"

یہ کہہ کر جاوید اپنے کمرے میں واپس آگیا۔

میں دعوت میں
مدعو نہیں تھا

ریسٹوران میں انسپکٹر پرویز اور جاوید ہال کے ایک ایسے کونے میں بیٹھے تھے جہاں سے وہ ایلا اور ٹھاکر دونوں پر نظر رکھ سکتے تھے۔

وہ پانچ بجے ہی ریسٹوران پہنچ گئے تھے۔ ٹھیک پانچ بج کر بیس منٹ پر ایلا اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنی ریزرو کرائی ہوئی میز پر آکر بیٹھ گئی اور وہ لوگ کافی وغیرہ منگا کر پینے لگے۔

چھ بجے ٹھاکر آیا اور ایلا کی جانب پیٹھ کر کے کاؤنٹر پر ہی اپنی مقررہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

ایلا خوب صورت تھی۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ ٹھاکر چھوٹے قد کا آدمی تھا، اور چالیس کے قریب ہوگا۔

انسپکٹر پرویز کی نظریں کبھی ایلا پر ہوتی تھیں، کبھی ٹھاکر پر اور کبھی کاؤنٹر پر لگے شیشے پر۔ جب کوئی بیرا ایلا کی میز پر جاتا تھا تو وہ بڑے غور سے ایلا اور بیرے کی حرکتیں دیکھتے تھے۔

جاوید ترچھی نظروں سے ایلا کو دیکھے جا رہا تھا۔ آدھے گھنٹے کے دوران میں کئی بار جاوید کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ کئی بار اس نے سر ہلایا۔ لیکن بولا کچھ نہیں۔

آخر ٹھاکر کے آنے کے آدھے گھنٹے بعد جاوید نے انسپکٹر کی جانب ذرا سا جھک کر آہستہ سے کہا "ڈیڈی، اب آپ دونوں کو گرفتار کرا لیجئے میں نے راز معلوم کر لیا ہے کہ ایلا کس طرح اس کو پیغام دیتی ہے۔"

"کیا واقعی؟" انسپکٹر نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں ——— سو فی صد۔"

انسپکٹر پرویز اپنے بیٹے کی ذہانت سے واقف تھے۔ وہ فوراً اٹھ کر گئے اور منیجر کے کمرے سے انہوں نے فون کر کے جنرل دیال سے کہا کہ راز حل ہو گیا ہے، دونوں مجرموں کو گرفتار کر لیا جائے۔

سات بجے کے قریب جب ٹھاکر جانے کے لئے اٹھا تو سیکرٹ سروس کے دو آدمیوں نے اس کو گرفتار کر لیا۔ اسی وقت ایلا کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

آدھے گھنٹے بعد جاوید اور انسپکٹر پرویز جنرل دیال کے دفتر کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ جنرل نے بڑی مشکل سے اپنے جوش کو دباتے ہوئے انسپکٹر سے پوچھا "اب مجھے بتایئے انسپکٹر پرویز، ایلا کس طرح ٹھاکر کو راز پہنچاتی تھی، اور یہ بات آپ کی سمجھ میں کیسے آئی۔"

"میں نے نہیں سمجھا سر،" انسپکٹر نے جواب دیا "میرے لڑکے جاوید نے یہ راز معلوم کیا ہے۔"

"آپ کے لڑکے نے؟" جنرل نے حیرت سے جاوید کی جانب

یقیناً وہ گھر پر ہی ہیں۔ اب ہوٹل میں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی

دیکھا۔ ان کے چہرے پر بے یقینی کے آثار دوڑ گئے۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ تیرہ چودہ سال کا یہ بچہ اتنا اہم راز کیسے حل کر سکتا تھا۔

"بتاؤ بیٹے" انسپکٹر نے جاوید سے کہا "تم خود اپنی زبان سے بتاؤ کہ تم نے یہ راز کیسے حل کیا؟"

جاوید نے کرسی پر پہلو بدلا اور مسکرا کر بولا۔

"سر یہ محض اتفاق تھا کہ میری سمجھ میں ترکیب آگئی۔ دراصل ابھی چند روز پہلے میں نے افریقہ کے حبشیوں کے بارے میں ایک کتاب پڑھی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ افریقہ کے جنگلوں میں رہنے والے حبشی آگ جلا کر دھوئیں کے ذریعے میلوں تک اپنے پیغامات بھیج سکتے ہیں۔ چنانچہ جب ڈیڈی نے مجھے بتایا کہ مس ایلا بہت سگرٹ پیتی ہے تو فوراً میرے ذہن میں خیال آیا کہ مس ایلا افریقی قبیلوں کی طرح دھوئیں کے سگنلوں سے تو پیغام نہیں بھیجتی ـــــ ہمارے یہاں چوں کہ بہت کم عورتیں سگرٹ پیتی ہیں، اس لئے مجھے اور بھی زیادہ شک ہوا تھا۔"

"خوش قسمتی سے میرا خیال درست ثابت ہوا۔ میں ڈیڈی کے ساتھ ریسٹوران میں آیا۔ ایلا مسلسل سگرٹ پی رہی تھی۔ وہ بالکل عام انداز میں سگرٹ کے کش لگا کر دھواں مونہہ سے نکالتی تھی۔ لیکن جیسے ہی جب ٹھاکر آکر بیٹھ گیا تو میں نے دیکھا کہ کش پر کش لگا کر اس کے دھواں چھوڑنے کے انداز میں ایک دم فرق آگیا۔"

"اب وہ کبھی چھلے بنانے لگتی، کبھی دھواں ایک دم سے نکالتی، کبھی ناک سے، کبھی تھوڑا سا دھواں نکال کر روک لیتی، اور تھوڑا تھوڑا روک روک کر باہر نکالتی۔ کبھی وہ سگرٹ کا دھواں ہونٹوں کے ایک کونے سے نکالتی، کبھی دوسرے کونے سے۔ کبھی وہ دھواں اوپر کی جانب چھوڑتی کبھی نیچے، اور کبھی مختلف زاویوں سے۔ اس سے مجھے یقین ہوگیا کہ دھوئیں کو ایک خاص انداز میں چھوڑنا ایک سگنل ہے، اور وہ پہلے سے مقررہ سگنلوں کے مطابق دھواں چھوڑ رہی ہے، جس کو ٹھاکر شیشے میں دیکھ رہا ہے اور ہر سگنل سے ایک حرف سمجھ کر پیغام اپنے ذہن میں محفوظ کرتا جا رہا ہے۔"

جنرل دیال کے چہرے پر حیرت تھی، اور انسپکٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ جاوید کے خاموش ہونے کے بعد بھی جنرل بہت دیر تک اس کو حیرت سے دیکھتے رہے۔ پھر وہ اٹھے اور جاوید کو اپنے سینے سے لگا کر بہت دیر تک اس کی کمر تھپکتے رہے۔ انہوں نے انسپکٹر سے کہا: "انسپکٹر پرویز، تمہارا بیٹا جوان ہو جائے گا تو اس کو میں اپنے محکمہ میں لوں گا۔ ہمیں ایسے ہی ذہین جوانوں کی ضرورت رہتی ہے۔"

جاوید نے جنرل کے کاندھے سے الگ ہوتے ہوئے کہا "جب تک میں جوان ہوں گا سر آپ ریٹائرڈ ہو چکے ہوں گے۔ اس لئے میں آپ کی جگہ لوں گا۔"

"مجھے یقین ہے برخوردار کہ ایک دن تم میری کرسی پر ضرور بیٹھو گے۔" جنرل نے مسکرا کر جواب دیا۔

اس کے بعد دونوں مجرموں کو بلا کر سوالات کئے گئے تو دونوں نے اپنا جرم مان لیا۔ ایلا نے قبول کر لیا کہ واقعی وہ دھوئیں کے سگنلوں سے ٹھاکر کو پیغام دیتی تھی۔

★ ★

حامد رشید ٹونکی

ٹنی دیو

ڈلن ایک غریب کسان تھا۔ وہ سمندر کے قریب ایک جھونپڑی میں اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ گزر اوقات بڑی مشکل سے ہوتی تھی۔ ایک روز وہ اپنی جھونپڑی کے باہر بیٹھا حقہ پی رہا تھا کہ ایک تھکا ہارا مسافر آیا اور اس سے رات گزارنے کی درخواست کی۔ آس پاس اور کوئی آبادی نہ تھی۔ جھونپڑی بہت چھوٹی تھی۔ جس میں اس کے بیوی بچے ہی مشکل سے رہتے تھے پھر بھی وہ نیک دل انسان تھا۔ اس نے کہا، جناب آپ خوشی سے میری جھونپڑی میں رات گزار سکتے ہیں۔ لیکن ہم غریب لوگ ہیں۔ اس لئے آپ کو آرام نہ مِل سکے گا۔ ہمیں خوشی ہوگی اگر آپ کھانا بھی ہمارے ساتھ کھائیں۔

"بہت بہت شکریہ میرے بھائی۔ یقین کیجیے۔ مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ اس کے بدلے میں میں آپ کے بچوں کو ایک دلچسپ کہانی سناؤں گا۔" مسافر نے کہا۔ یہ سنتے ہی بچے اس کے پاس آکر بیٹھ گئے اور خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ مسافر اپنا سامان رکھ کر آرام سے بیٹھ گیا۔ کسان کی بیوی کھانا بنانے میں مصروف تھی۔

مسافر نے کہنا شروع کیا:

"میرے بچو یہ بہت پرانے زمانے کی بات ہے۔ اس وقت لوگوں کی اتنی آسانیاں میسر نہ تھیں جتنی آج ہیں۔ اس وقت انسان کو ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرنا پڑتا تھا اور لوگ بڑی مصیبت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ منصور بھی ان ہی غریب لوگوں میں سے ایک تھا۔ اُسے اور اس کے بیوی بچوں کو اکثر فاقوں پر گزر کرنا پڑتی۔

"ڈاکٹر صاحب اس کے دانتوں کا معائنہ کیجیے
کئی روز سے اس نے کسی کو نہیں کاٹا۔"

منصور بہت دن سے سوچ رہا تھا کہ بیوی بچوں کو لے کر کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں زندگی آرام سے بیت سکے۔ اسی کی طرح اس کے اور بہت سے ساتھی بھی پریشان تھے۔ ایک دن سب نے اپنے مکان اور سامان فروخت کر کے کرائے کے لائق رقم اکٹھی کی اور ایک جہاز پر سوار ہو گئے۔ انہوں نے سنا تھا کہ سمندر پار بہت اچھی اچھی اور زرخیز زمینیں بے کار پڑی ہیں جو بھی انہیں لینا چاہے مفت حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن افسوس یہ لوگ اس جگہ تک نہ پہنچ سکے۔ جہاز لکڑی کا اور بادبانی تھا۔ سمندر میں سخت طوفان آیا اور جہاز بھٹک گیا۔ آخر جہاز ایک جزیرے سے ٹکرایا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ منصور اس کے بیوی بچے اور کچھ ساتھی بچ نکلے اور جزیرے پر آ گئے۔ ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ جزیرہ غیر آباد ضرور ہے لیکن انتہائی شاداب اور زرخیز زمین والا ہے۔ جگہ جگہ سیب، ناشپاتی، کھجور، ناریل اور دوسرے پھلوں کے پیڑ اُگ رہے تھے۔ جن کے نام وہ نہیں جانتے تھے، لیکن ذائقے سب ہی کے اچھے تھے۔ سب نے خدا کا شکر کیا۔ بسنے کے لئے اس سے بہتر جگہ اور کون سی ہو سکتی تھی۔ سب نے مل کر ٹوٹے جہاز سے جو سامان بھی بچ رہا ہو سکا اتارا۔ اوزار، ڈھول، کھانے کا سامان، اناج کے بورے، لکڑی کے تختے وغیرہ سب اتارتے اور پھر آہستہ آہستہ سب لوگ جزیرے پر ایک ایک دو دو فرلانگ کے فاصلے سے بس گئے ہر ایک نے ضرورت کے مطابق زمین پر قبضہ کر لیا۔ منصور نے بھی ایک چپٹی چٹان دیکھ کر اپنی جھونپڑی بنالی اور احاطہ بنا کر باغ لگایا۔

ایک سال بیت گیا۔ اب ہر ایک کے پاس لکڑیوں سے بنا مکان تھا۔ اپنے کھیت تھے۔ جن میں گیہوں کی کاشت کی گئی تھی۔ سب ہی کے یہاں کافی غلہ پیدا ہوا۔ لیکن مشکل یہ آپڑی تھی کہ گیہوں کو پیس کر آٹا بنانے کے لئے ان لوگوں کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ غریب منصور کا خاندان چونکہ بڑا تھا، اس لئے اسے اور اس کی بیوی کو گیہوں دو چپٹے پتھروں کے درمیان رکھ کر پیسنے میں کافی وقت لگ جاتا تھا۔ خدا نے انہیں سب ہی کچھ دے رکھا تھا اناج، پھل، ترکاریاں، جنگل کی لکڑی۔ مگر آٹا پیسنے کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم تھا۔ پتھروں سے رگڑنے سے آٹا اتنا باریک بھی نہیں ہوتا تھا کہ استعمال میں لایا جا سکے۔ مجبوراً اسی پر سب کو گزر کرنی پڑتی تھی۔

ایک روز منصور کام سے ہٹ کر سیر کو نکل گیا۔ وہ چلتا رہا اور اپنے گھر سے کافی دور نکل آیا۔ یہ جگہ ایک خوب صورت وادی تھی۔ اس جگہ وہ پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ ہرے بھرے پھل دار درخت بیچ میں ایک ندی بہہ رہی تھی۔ کچھ خوب صورت پھولوں کے پیڑ بھی نظر آئے۔ یہ جگہ اسے اتنی پسند آئی کہ وہ آگے بڑھتا ہی رہا۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جنت میں آ گیا ہو۔ یکایک درختوں کے درمیان سے ایک ایسی شے نظر آئی جس سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور وہ ڈر کی وجہ سے کانپنے لگا۔

وہ ایک دیو تھا۔ بالکل انسانی شکل و صورت کا۔ وہ ایک

بڑے موٹے تنے والے برگد کے پیڑ سے ٹیک لگائے سو رہا تھا
اس کا قد کسی طرح بھی تیس چالیس فٹ سے کم نہ ہوگا۔ منصور
بھاگنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک دیو نے آنکھیں کھول دیں
اور اسے مسکرا کر دیکھا۔ منصور نے ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش
کی مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کے ہوش ٹھکانے
آتے جا رہے تھے۔ دیو بالکل خاموش لیٹا پیار بھری نظروں سے
اسے دیکھ رہا تھا۔ یقیناً وہ خوں خوار اور ظالم نہیں تھا۔ ورنہ اب
تک وہ اسے پکڑ کر ضرور نگل جاتا۔ پھر اسے پہاڑ کی سی گونج سنائی دی
"میرے دوست، ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے
ہزاروں گناہ طاقتور اور مضبوط ضرور ہوں، لیکن ظالم نہیں ہوں،
اس لئے میرے قریب آؤ۔" دیو نے کہا۔
"لیکن میں نے پڑھا ہے کہ دیو بڑے ظالم ہوتے ہیں اور
انسانوں کو کھا جاتے ہیں۔" منصور نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔
"یہ غلط ہے۔ بلکہ جو انسان میری قدر کرتے ہیں میں ان
کی زندگی سدھارنے میں بے حد کام آتا ہوں" دیو نے جواب دیا۔
"پھر تو آپ ہماری کافی مدد کر سکتے ہیں، کیوں کہ خدا نے
آپ کو کافی طاقت بخشی ہے۔" منصور اب نڈر ہو چکا تھا۔
"اتنا طاقتور کہ تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ شرط صرف
یہ ہے کہ تم مجھے کام کرنا سکھاؤ۔ بڑے سے بڑا کام جو تم جیسے ہزاروں
انسان مل کر نہیں کر سکتے۔ میں چٹکی بجانے میں کر سکتا ہوں۔" لیکن
یہ تمہیں سکھانا ہوگا۔ اب تک میں نے کوئی کام نہیں کیا ہے"
دیو نے کہا۔
"اگر ایسا ہے تو میں تمہیں کام کرنا ضرور سکھاؤں گا۔" پھر
منصور نے دل میں سوچا کہ سب سے زیادہ وقت آٹا پیسنے میں
ہوتی ہے، اس لئے، کیوں نہ اس دیو سے آٹا پسوایا جائے۔ لیکن
اچانک وہ اداس ہو گیا۔ اور سوچنے لگا کہ کام تو خیر میں اس کو سکھا
دوں گا، لیکن دیو اس کی اجرت مانگے گا تو میں کہاں سے دوں گا؟"

"میں تمہارے برابر والے ٹیلی فون بوتھ سے
بول رہا ہوں۔"

یہاں جزیرے میں رکھا ہی کیا ہے؟ ڈرتے ڈرتے وہ پوچھ بیٹھا۔
"کیوں جناب آپ اپنے کام کا معاوضہ کیا لیں گے؟"
"میں نہیں جانتا معاوضہ کسے کہتے ہیں۔ جو لوگ کام
لینا جانتے ہوں میں ان کا کام کرتا ہوں۔"
"بہت خوب دوست۔ میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں
لیکن اب ہمیں واپس مکان لوٹنا ہے۔ میں بہت دور نکل آیا ہوں۔ کیا
آپ مجھے گھر تک لے جا سکتے ہیں؟" منصور نے خوشی سے جھومتے
ہوئے کہا۔ یہ دیو اسے بہت سیدھا سا معلوم ہوا۔
"میں تمہیں ضرور لے جاؤں گا۔ مگر کس طرح، یہ تمہیں
بتانا ہوگا۔ کیا میں تمہیں بغل میں داب کر لے چلوں؟ دیو نے پوچھا
"نہیں۔ تم کسی درخت سے دو موٹی موٹی شاخیں کاٹ کر
جوڑ لو اور انہیں اپنے پیٹ پر لٹکا دو
میں ان پر بیٹھ جاؤں گا "
منصور نے جواب دیا۔

دیو نے دیکھتے دیکھتے دو موٹے سے لٹھے کاٹ کر توڑے
اور اپنے پیٹ پر لٹکا لئے اور پھر چلنا شروع کیا۔ بالکل ایسا معلوم
ہوتا تھا جیسے ہوئے ہوئے دیو پانی پر تیر رہا ہو۔ ذرا سی دیر میں منصور
اپنے گھر پہنچا۔ منصور کے بیوی بچے دیو کو دیکھ کر بے حد خوف زدہ
ہوئے۔ بچے تو چیختے ہوئے بھاگ گئے۔ لیکن جب بیوی نے منصور
کو دیو کے پیٹ پر سوار دیکھا تو رونے پیٹنے لگی اور دیو کے پاس پر گر کر
اسے آزاد کرنے کی درخواست کرنے لگی۔

"دیو نے کہا" اچھی خاتون، ڈرنے کی ضرورت نہیں۔
آپ کے شوہر بالکل آزاد ہیں اور اپنی مرضی سے ہی مجھ پر سوار
ہو کر آئے ہیں۔"

"منصور نے اتر کر بیوی، بچوں کو ساری بات بتائی
تب جا کر ان کا ڈر کم ہوا۔ پھر یہ جان کر انہیں اور بھی خوشی ہوئی کہ
انہیں اب آٹا پیسنا نہیں پڑے گا۔"

"لیکن ایک بات ہے۔" بیوی نے سوچتے ہوئے آہستہ
سے کہا۔ ہم اس دیو کو کیا کھلائیں گے؟ ایک دو روز میں ہی یہ یہاں
کا سب کچھ کھا جائے گا پھر ہمارا نمبر آئے گا۔ اس کے علاوہ یہ رہے
گا کہاں؟ اس کے لئے تو دس گنا بڑا مکان چاہئے۔"

"اوہ، یہ تو میں نے سوچا ہی نہ تھا" منصور ایک بار پھر
رنجیدہ ہو گیا۔ پھر اس نے دیو سے کہا۔

"کیوں بھائی، تمہارے لئے کھانے کے لئے کیا انتظام ہوگا
اور رہنے کے لئے بھی بہت بڑا مکان چاہئے۔"

"میں صرف پانی پیتا ہوں۔ کھانا کچھ نہیں۔ جہاں تک رہنے
کا سوال ہے۔ میں کھلے میدانوں میں ہری ہری گھاس پر رہتا ہوں
اس لئے میرے لئے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" دیو نے ہنستے ہوئے
جواب دیا۔ یہ سن کر تو سب ہی خوش ہو گئے

مفت کا ایک نوکر جو
ان کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

پھر یہ طے کیا گیا کہ سب سے پہلے دیو سے کون سا کام
لیا جائے۔ آٹا پیسنے کا مسئلہ سب سے بڑا تھا۔ انہوں نے سوچا
کہ اگر دو بڑے بڑے پتھروں کے پاٹ بنا لئے جائیں تو آٹا بڑی آسانی
سے پیسا جا سکتا ہے۔ منصور نے اوزار نکالے اور دیو کے ساتھ
جہاز سے لائے ہوئے ایک بڑے صندوق میں بیٹھ کر پتھر لانے
روانہ ہو گیا۔ لکڑی کا ایک بڑا ڈنڈا اس کے ہاتھ میں تھا۔ جلد ہی
دو بڑے بڑے پتھر دیو کی مدد سے آ گئے اور دیو نے آٹا پیسنا شروع
کر دیا۔ دن رات وہ کام کرتا رہا۔ رات گئے منصور کی آنکھ کھلی تو اس
نے گڑگڑاہٹ کی آواز سنی۔ دیو اس وقت آٹا پیسنے میں مصروف
تھا۔ اس نے دیو سے کچھ دیر آرام کرنے کو کہا تو دیو نے جواب دیا میں
دن رات کام کرنے کا عادی ہوں۔ اس لئے رات ہونے سے کوئی
فرق نہیں پڑتا۔ صبح ہوتے ہوتے منصور کے گھر میں جتنا غلہ تھا۔
سب کا سب پیسا جا چکا تھا۔

اب منصور کو فکر ہوئی کہ دیو سے دوسرا کیا کام لیا جائے۔
دور جنگل میں ایک تناور درخت گر پڑا تھا۔ منصور چاہتا تھا کہ کسی
طرح وہ یہاں تک آ جائے تو اس کے تختے بنا کر مکان کی چھت اور
دروازے وغیرہ بنا لے۔ دیو بڑی آسانی سے پورا درخت اٹھا لایا۔
منصور نے جہاز ایک آرا بھی حاصل کیا تھا۔ اس نے دیو کو سمجھایا
کہ کس طرح لکڑی کے تختے بنائے جاتے ہیں۔ چند ہی گھنٹوں میں
تختے بھی تیار ہو گئے۔

پڑوس میں ایک بڑھئی بھی رہتا تھا۔ اس نے منصور کے
لئے اس شرط پر میز، کرسیاں اور لکڑی کی الماری تیار کر دی کہ وہ
اس کا آٹا دیو سے پسوا دے۔ یہ سودا طے ہو گیا پھر تو یہ حالت ہوئی کہ
سب ہی بستی والے منصور کے پاس آتے اور اپنا آٹا پسوا کر لے جاتے
بدلے میں کوئی شکار دے جاتا، کوئی پھل، کوئی مچھلیاں اور دوسری
ضرورت کی چیزیں۔ اس طرح منصور کو ضرورت کی ہر چیز آپس کے
لین دین سے ملنے لگی اور دوسرے لوگوں کا بھی کام چلنے لگا۔

مردوں کو کافی فرصت ملنے لگی اور وہ دوسری باتوں کی طرف دھیان دینے لگے۔ بستی کی عورتوں کو بھی کافی وقت مل گیا۔ مرد بڑے بڑے تناور درخت کاٹنے لگے اور دیو ان کے تختے بناتا رہا۔ اس طرح پوری بستی میں لکڑی کے مکان کھڑے ہوگئے۔ گھر گھر میں فرنیچر ہوگیا۔ دروازے کھڑکیاں اور احاطے تک لکڑی کے بنا دیے گئے۔ لوگوں کا لالچ بڑھتا ہی رہا اور وہ سوچنے لگے۔ کاش اگر ایسا ہی ایک دیو اور مل جاتے تو زندگی کی دوسری ضروریات بھی آسانی سے پوری ہوجائیں۔ ایک روز منصور نے پوچھ ہی لیا؟ کیوں دوست، اس جزیرے پر تم تنہا ہی ہو یا تم جیسا کوئی اور بھی موجود ہے؟

"دیو نے جواب دیا" ہاں میرا ایک بھائی موجود ہے۔ لیکن ہماری ملاقات بہت کم ہوتی ہے۔ میں وادیوں میں رہتا ہوں اور وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہتا ہے۔"

"کیا تمہاری طرح وہ بھی اتنا ہی کام کرتا ہے؟"

"مجھ سے بھی کہیں زیادہ۔ لیکن صرف اس وقت جب اس کی مرضی ہو۔ اس کے علاوہ اسے بہت جلد غصہ بھی آجاتا ہے جب کہ میں خاموشی پسند ہوں۔ البتہ وہ ضرور کبھی کبھی مجھے خفا ہونے پر مجبور کردیتا ہے۔" دیو نے کہا۔

یہ سن کر منصور خاموش ہوگیا۔ لیکن اس کی تلاش برابر جاری رہی۔ ایک روز وہ شکار کھیلتا ایک اونچے پہاڑ پر نکل آیا۔ دور سے اسے چوٹی پر کوئی بڑی سی شے بیٹھی نظر آئی۔ اس نے سوچا ضرور یہ دیو کا بھائی ہے۔ اب ڈر کا تو سوال ہی نہ تھا، اس لئے آہستہ آہستہ وہ اس کی طرف بڑھا۔ دیو کے بادبانوں کی طرح دو بڑے پر لگے تھے

"میں جانتا ہوں تم کیوں میرے پاس آتے ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم لوگ میرے سست بھائی سے کام بھی لینے لگے ہو۔ تمہارا کام کرنے کو میں بھی تیار ہوں لیکن یہ نہ بھولنا کہ میں تمہارے حکم کا پابند نہیں رہوں گا۔ جب چاہوں گا کام کروں گا اور جب چاہوں گا کام بند کردوں گا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے، میرا

"پچھلے ہفتے ہم نے پانچ لاکھ لیں، مگر اخبار والوں نے تین لاکھ لکھے ہیں، کیا خیال ہے، اخبار والوں کو خط لکھ کر بتائیں کہ وہ کل کے اخبار میں رقم ٹھیک لکھیں۔"

سست بھائی اپنی دھن میں آہستہ آہستہ ایک ہی سمت میں بڑھتا ہے لیکن میں جب چاہوں اپنی سمت بدل سکتا ہوں۔ کبھی کبھی مجھے بھائی کو تیز رفتار بنانے کے لئے دھکا بھی دینا پڑتا ہے۔ اکثر وہ جب بھاری چیزیں لے جاتا ہے۔ تو مجھے اس کی مدد بھی کرنی پڑتی ہے۔ پھر میں اچانک اسے چھوڑ کر غائب ہو جاتا ہوں بے جا دخل اندازی کر کے کبھی کبھی میں اسے ناراض بھی کر دیتا ہوں" دیو نے بتایا۔

"تب تو آپ ہمارا کام کیوں کرنے لگے"

"نہیں میں ضرور کروں گا۔ لیکن اپنی مرضی سے۔ میرے لئے اور بھی بڑے بڑے پتھر مہیا کرو اور ان کے پاٹ بناؤ۔ پھر دیکھو میں ایک گھنٹے میں اتنا آٹا پیس دوں گا کہ میرا بھائی دن بھر میں بھی نہیں پیس پائے گا۔ اپنے بھائی کی طرح ہی میں بھی نہ مزدوری لوں گا اور نہ کھانے پینے کو تم سے مانگوں گا۔"

منصور یہ سن کر اور زیادہ خوش ہوا وہ دوسرے دیو کو بھی اپنے گھر لے آیا۔ ادھر بستی والے ایک بڑا چکی گھر بنانے میں مصروف ہوگئے۔ جلدی آٹا پیسنے کا کارخانہ تیار ہوگیا۔ اناج بھر بھر کر آنے لگا۔ لیکن دیو نے کام شروع نہیں کیا۔ آخر تھوڑی دیر بعد وہ آیا اور چکی کے پاٹ تیزی سے گھومنا شروع ہوگئے۔ دیکھتے دیکھتے بستی کا آٹا پسنے لگا۔ لیکن پھر اچانک دیو کام چھوڑ کر غائب ہوگیا۔ پتھر رُک گئے اور سب مونہہ دیکھتے رہ گئے۔ چند گھنٹے بعد ہی وہ پھر آیا اور کام شروع کر لیا۔

بستی والے اب بہت خوش تھے۔ دو دو طاقتور دیوان کا کام مفت کر رہے تھے۔ ان کا لالچ اور بڑھا۔ منصور نے ایک روز پہلے دیو سے پوچھ ہی لیا "کیوں دوست، تم دونوں بھائیوں کے علاوہ کوئی اور دیو بھی تمہاری نظر میں ہے؟"

"ہاں ہے تو اور وہ خود میرا بیٹا ہے۔ مگر افسوس، عرصہ سے اس کی کوئی خبر نہیں، حالانکہ وہ ہم دونوں بھائیوں سے زیادہ طاقت ور ہے۔ آخری بار اسے جزیرے کے دوسرے کنارے پر گرم اُبلتے ہوئے چشموں کے پاس دیکھا گیا تھا۔ اپنی ماں کی طرح اسے بھی گرم مقامات پر رہ کر طاقت ملتی ہے۔ لیکن ہم میں اور اس میں ایک فرق ضرور ہے۔ کام کرنے کے لئے اسے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر اس کا پیٹ نہ بھرا جائے تو وہ کام نہیں کرتا۔" پہلے دیو نے کہا۔

یہ سن کر منصور اداس ہوگیا۔ اتنے طاقت ور دیو کا پیٹ بھرنے کے لئے تو سارے جزیرے کا غلہ بھی ناکافی ہوگا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ آخر میں آدمیوں کو کھانے لگے گا پھر بھی اس نے پوچھ ہی لیا "کیا پیٹ بھرنے کے بعد وہ بہت کام کرے گا؟"

"بے حد اتنا کہ ہم دونوں بھائی بھی نہیں کر سکتے لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ اسی وقت کام کرتا ہے جب اسے قید میں رکھا جائے اور اسے قید کرنا بڑا مشکل کام ہے۔"

"مان لو ہم اسے کام پر راضی بھی کرلیں تو اتنا اسے کہاں سے کھلائیں گے؟" منصور نے پوچھا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ اناج نہیں کھاتا۔ اس کی غذا جلتے ہوئے کوئلے اور لکڑیاں ہیں۔ دہکتا ہوا ایندھن اس کی مرغوب غذا ہے اور اس جزیرے میں ان چیزوں کی کمی نہیں"

"لیکن ہم اس کے لئے اتنا بڑا قید خانہ کہاں سے لائیں گے؟"

"یہ درست ہے کہ جب وہ آزاد ہو تو آسمان سے باتیں کرتا ہے لیکن جتنی چھوٹی چیز میں قید کیا جائے اتنا ہی زیادہ کام بھی کرتا ہے۔ پھر مزہ یہ ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی جگہ قید ہونے پر بھی اسے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔"

"لیکن دوست، بھلا وہ ہماری قید میں رہنا کیوں پسند کرے گا؟"

"دراصل وہ تو قید ہو جانے کے بعد آزاد ہونے کی جدوجہد کرنے کے لئے ہی سخت سے سخت کام کرتا ہے، کیونکہ میرے بڑے بھائی کی طرح وہ بھی آزادی پسند ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ اگر تم ہماری مدد کرو تو شاید ہم اسے قابو کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔"

دیو اس پر راضی ہوگیا اور دوسرے دن وہ اس کی تلاش میں روانہ ہوگئے۔ منصور دیو کی پشت پر سوار تھا۔ راستے میں اس نے پوچھا "کیوں دوست، تم اسے قید کس چیز میں کرو گے؟"

"اس میں" دیو نے اسے ایک بوتل دکھاتے ہوئے کہا۔

"واہ اب تم بھی مجھ سے مذاق کرنے لگے!" منصور نے کہا۔

"نہیں، میں مذاق نہیں کرتا۔"

تھوڑی دیر میں وہ گرم ابلتے پانی کے چشموں کے پاس

پہنچ گئے جن سے ابخرات بڑی تیزی سے نکل کر آسمان کی طرف جا رہے تھے اور پانی ابل رہا تھا۔

"وہ — وہ رہا، وہ — دیکھو — غور سے دیکھو — وہ ہے میرا لڑکا اور تیسرا دیو ہے۔" پہلے دیو نے بتایا۔

منصور نے غور سے دیکھا، پانی کی بھاپ بڑی تیزی سے چشموں سے اٹھ کر آسمان کی طرف جا رہی تھی اور دور اونچائی پر وہ بھاپ دیو کی شکل اختیار کرتی محسوس ہوئی اور پھر فوراً ہی وہ شکل غائب بھی ہو گئی۔

"لو وہ فرار ہو گیا۔ اب اس کا ہاتھ لگنا مشکل ہے۔" منصور نے نا امید ہو کر کہا۔

"نہیں اسے ٹھنڈ پسند نہیں ہے۔ وہ جلد ہی واپس آئے گا اور پھر ہم اسے اس بوتل میں قید کرلیں گے۔" دیو نے جواب دیا۔

جلد ہی چشمے کا پانی پھر کھولنے لگا۔ دیو نے بوتل کا کارک نکال کر اسے چشمے کے اوپر کر دیا۔ ابخرات اٹھے اور بوتل میں بھرنے لگے۔ منصور یہ سب کچھ بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ جب بوتل کافی بھاری ہو گئی تو اس نے دیو کے اشارے پر کارک لگا دیا۔

"بس اب یہ کہیں نہیں جا سکتا۔" دیو نے کہا۔ "چلو اب واپس چلیں۔"

دونوں بستی لوٹ آئے۔ منصور بہت خوش تھا۔ اس نے تیسرے دیو کو بھی قابو میں کر لیا تھا۔ لیکن اس کو اب بھی اس بات کا یقین نہ تھا کہ دیو واقعی پکڑا لیا گیا ہے۔ "اس نے کہا، اگر وہ واقعی بوتل میں قید ہے تو پھر کسی بھیڑ کی طرح مسکین اور بے بس بھی ہو جاتے گا۔" منصور نے پہلے دیو سے کہا۔

"اوہ، وہ چونکہ اس وقت ٹھنڈا ہو رہا ہے، اس لئے خاموش ہے۔ لیکن گرم ہونے کے بعد وہ بے حد خطرناک ہو جاتا

"ڈیڈی میں پاس تو ہو گیا ہوں مگر شاید
جگہ کی کمی کی وجہ سے اخبار والوں نے میرا نام نہیں چھاپا!"

ہے۔ گھر جا کر اسے آگ کے قریب رکھنا، کیوں کہ گرمی ہی اس کی زندگی ہے۔" دیو نے جواب دیا۔

گھر پہنچ کر منصور نے بوتل اُبلتے ہوتے پانی کے برتن میں رکھ دی۔ چند ہی لمحوں میں کارک اُڑ کر دور گرا۔ پھر اس نے دیو کو دیکھا جو بوتل سے نکل کر اوپر کی چمنی کے ذریعہ غائب ہو گیا منصور کو یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ قیدی بڑی آسانی سے فرار ہو چکا تھا۔ وہ پہلے دیو کے پاس گیا اور حالات بتائے۔"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اب کی بار ہم اسے کسی دھات کے مضبوط برتن میں قید کریں گے جس سے وہ فرار نہ ہو سکے، حالاں کہ اگر وہ زیادہ گرم ہو جاتے تو دھات کو توڑ کر بھی فرار ہو سکتا ہے، لیکن برتن میں ایک بہت چھوٹا سوراخ رکھیں گے تاکہ وہ فرار نہ ہو سکے۔" دیو نے جواب دیا۔

دوسرے دن وہ گرم چشموں پر جا کر دیو کو پھر سے قید کرلاتے۔

تیسرے دیونے گرفتار ہوتے ہی منصور سے صلح کرلی اور باقاعدہ کام شروع کر دیا۔ لیکن یہ شرط بھی رکھی کہ اس سے لکڑی چیرنے یا اناج پسوانے کا کام نہ لیا جائے۔ اس کے بدلے وہ کانوں سے کوئلہ نکالے گا، اونی، سوتی کپڑے کے مل چلائے گا تاکہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ کپڑا میسر آسکے۔

منصور نے دیو کی بات مان لی۔ کپڑوں کی انہیں سخت ضرورت تھی، اس لئے بستی والوں سے ملا اور مل تیار کرنے کی بات چیت کی۔ پوری بستی کے کاریگر خوشی سے تیار ہو گئے اور تیزی سے کام شروع ہو گیا۔

کئی سال گزر گئے۔ لوگ اعلیٰ درجہ کے کپڑے استعمال کرنے لگے۔ تینوں دیو مل کر کام کرتے بستی میں ترقی ہوتی گئی۔ لوگ زیادہ سے زیادہ مکان بنانے لگے۔ وہ فرنیچر بناتے، کشتیاں بنانے، جہاز بناتے۔ اس طرح زندگی کی قریب قریب ہر ضرورت کی چیز تیار ہونے لگی۔ عورتیں لباس تیار کرنے لگیں۔ یہ ہی نہیں بلکہ بچیوں کے لئے ایک اسکول کھولا گیا۔ جس میں سلائی کا کام سکھایا جانے لگا۔ ساتھ ہی پڑھنا لکھنا بھی سکھایا گیا۔ عبادت کے لئے مندر، مسجد اور گرجا بناتے گئے۔ تاکہ لوگ اپنے اپنے مذہب کے مطابق خدا کا شکر ادا کرسکیں۔

خوش حالی بڑھ چکی تھی۔ اب ان لوگوں نے اور ہاتھ پاؤں مارے اور نئی جگہ کی کھوج کا ارادہ کیا تاکہ بڑھتی ہوئی آبادی پر قابو پایا جاسکے۔ چنانچہ ایک بڑا جنگی جہاز بڑی محنت اور کئی سال کی تیاری کے بعد بنایا گیا۔ لیکن اب تینوں دیو نے جھگڑنا شروع کر دیا۔ ہر ایک کہتا تھا کہ جہاز میرے چارج میں رہے گا۔ پہلے نے دلیل پیش کی کہ جہاز اس کی مدد کے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔

"لیکن جب میں اپنے طاقت ور بازو پھیلاؤں گا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے چلنے سے روک نہیں سکتی۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"اور میں اپنی طاقت سے اسے کسی بھی سمت موڑ کر لیجا سکتا ہوں۔ جب کہ تم دونوں ایسا نہیں کر سکتے۔" تیسرے نے دعویٰ کیا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ تینوں ہی مل کر کام کریں گے۔ پہلا دیو جہاز کو ندی سے سمندر میں ڈال دے گا اور جب تک جہاز ایک ہی سمت چلے گا۔ دوسرا دیو اس کا انچارج رہے گا۔

جہاز چند نوجوانوں اور بوڑھوں کو لے کر روانہ ہو گیا۔ یہ لوگ اپنے جزیرے میں تیار ہونے والی چیزیں بھی لے گئے۔ بدلے میں وہ ملکوں سے نیا نیا مال جو ان کے یہاں تیار نہیں ہوتا تھا ساتھ لاتے۔ اس طرح برسوں کا آپس کا کاروبار چلتا رہا۔ لوگ ایک دوسرے کے ملکوں میں آتے جاتے رہے، سب ملک خوش حال اور ترقی یافتہ ہوتے گئے۔ اور بچو آج تم دیکھ رہے ہو کہ دنیا کس مقام پر پہنچ چکی ہے۔ فاصلے اور دوریاں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ آج ماسکو سے ہندوستان صرف چھ گھنٹے میں پہنچا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ہندوستان سے لندن بھی اسی وقت میں پہنچ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے کارخانے چل رہے ہیں ہر ملک چند مخصوص چیزیں تیار کر رہا ہے اور جو ملک وہ چیزیں تیار نہیں کرسکتے وہ ایک دوسرے سے اپنی ضرورتوں کا مال بدل لیتے ہیں اور یہ سب کچھ صرف ان تین انسان دوست دیو کی مدد سے ہو رہا ہے۔ ان میں سے پہلا دیو ہے پانی کی طاقت کا دیو، دوسرا ہوا کی طاقت کا دیو اور تیسرا بھاپ کی طاقت کا دیو۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ بچے حیرت سے مسافر کو دیکھ رہے تھے اور حیران تھے کہ آخر یہ دیو کون ہو سکتے ہیں۔ لیکن کہانی کے خاتمے پر مسافر نے خود ہی بات صاف کر دی تھی۔ سب ہی مسکراتے ہوئے اٹھے۔ اتنا تو وہ بھی جانتے تھے کہ آج سب طاقت پانی، بھاپ اور ہوا کے ذریعہ ہی پیدا کی جاتی ہے۔ مسافر بھی مسکراتا ہوا اٹھا اور کھانا کھانے کے بعد سونے چلا گیا۔

■■

بھائی کا جادو

سرجیت

بہت دن پہلے کی بات ہے، ایک گاؤں میں دو بھائی رہتے تھے۔ ان کا باپ ایک غریب کسان تھا۔ بڑا بھائی بُری صحبت میں پڑ کر چور بن گیا۔ باپ نے اسے بہت سمجھایا، لیکن وہ اپنی بُری عادت نہ چھوڑ سکا۔ تنگ آ کر باپ نے اسے گھر سے نکال دیا۔

کچھ دن کے بعد کسان اچانک بیمار پڑ گیا اور چند روز بیمار رہنے کے بعد چل بسا۔ کسان کے پاس تھوڑی سی زمین تھی۔ چھوٹا بھائی اور اس کی ماں اسی زمین کو گاؤں کے ساہوکار کے پاس گروی رکھ کر اپنا گزارہ چلانے لگے۔ چھوٹا بھائی بہت محنتی تھا۔ اس نے زمین گروی رکھتے وقت سوچا کہ وہ شہر میں جا کر روپے کمائے گا، اور پھر اپنی زمین ساہوکار سے واپس لے لے گا۔ یہ سوچ کر اس نے ایک دن ماں سے اجازت لی اور شہر کی طرف چل پڑا۔

شہر میں وہ ایک ڈاکٹر کے یہاں نوکر ہو گیا۔ ڈاکٹر اس کی محنت، اور ایمان داری سے بے حد خوش رہتا تھا۔ چھوٹا بھائی خرچ بھی کم کرتا تھا، اور زیادہ سے زیادہ پیسے بچاتا تھا۔ اس طرح وہ کئی برس تک پیسے بچاتا رہا، یہاں تک کہ اس نے دو سو روپے جمع کر لیے۔ ایک دن اس نے ڈاکٹر سے کہا "ڈاکٹر صاحب اب میں گاؤں جا کر اپنی ماں کی خدمت کروں گا۔"

ڈاکٹر اس کی بات سن کر بہت خوش ہوا۔ اس کے چلتے وقت ڈاکٹر نے بھی اپنی طرف سے اسے کچھ روپے دے دیئے۔

چھوٹا بھائی گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں ڈاکوؤں نے اسے گھیر لیا اور اس سے تمام رقم چھین لی۔ روپیوں کے یوں چھن جانے پر اسے بہت دکھ ہوا۔ اس نے سوچا کہ روپیوں کے بغیر وہ گاؤں

جا کر کیا کرے گا؟ اس نے ڈاکوؤں سے کہا" بھائیو، مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ میں تم لوگوں کی خدمت کروں گا۔"

ڈاکوؤں کو اس پر ترس آگیا اور سردار نے اس کی بات مان لی۔ انہوں نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور اسے اپنے ٹھکانے پر لے گئے۔ وہ ڈاکوؤں کا کھانا تیار کرنے لگا۔

ایک روز اس نے ڈاکوؤں کے سردار سے کہا" بھائی، میں اب پھر شہر کو جانا چاہتا ہوں۔ اس لئے مجھے اجازت دیجئے۔ آپ نے مجھ سے دو سو روپے لئے تھے۔ اس کے بدلے آپ مجھے ایک چھوٹی سی تلوار دے دیجئے، تاکہ میں جنگلی جانوروں سے اپنی حفاظت کرسکوں۔"

ڈاکوؤں کے سردار نے لمحہ بھر سوچا، پھر اسے شہر جانے کی اجازت دے دی اور کہا" ہم لوٹی ہوئی چیزیں واپس نہیں لوٹاتے۔ ویسے ہمارے پاس بہت سی تلواریں ہیں۔ تم ان میں سے کوئی تلوار لے لو۔"

ڈاکوؤں کے سردار نے اس کے سامنے بہت سی تلواروں کا ڈھیر لگا دیا۔ اس نے ایک زنگ لگی تلوار لے لی۔ ڈاکوؤں نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور اسے سڑک پر چھوڑ گئے۔

چلتے چلتے چھوٹا بھائی شہر پہنچ گیا۔ اس نے ڈاکٹر کے پاس جا کر اسے اپنی دکھ بھری داستان سنائی۔ ڈاکٹر نے اسے پھر نوکر رکھ لیا۔ ڈاکٹر تلواروں کا بہت شوقین تھا۔ اس نے چھوٹے بھائی کی زنگ لگی تلوار کو دیکھا تو کچھ ایسا لگا جیسے یہ تلوار بہت نایاب اور پرانے زمانے کی ہو۔ اس کا ایک دوست تلواروں کا ماہر تھا۔ ڈاکٹر نے اسے تلوار دکھائی۔ وہ اس تلوار کو دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑا اور کہنے لگا" یہ تلوار بیچ بیچ بے حد نایاب اور قیمتی ہے۔ اگر تم یہ تلوار بیچنا چاہو تو میں چار سو روپے میں اسے خرید سکتا ہوں۔"

چھوٹے بھائی نے فوراً تلوار چار سو روپے میں بیچ دی۔ اب اس کے پاس کافی روپے ہوگئے تھے۔ اس لئے اس نے پھر گاؤں جانے کا فیصلہ کیا۔

راستے میں اس کی ملاقات پھر ڈاکوؤں کے سردار سے ہوئی۔ سردار اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ چھوٹے بھائی نے سلام کرنے کے بعد جیب سے دو سو روپے نکال کر ڈاکوؤں کے سردار کے سامنے رکھ دیئے۔ ڈاکوؤں کے سردار نے پوچھا" یہ روپے کیسے؟"

چھوٹے بھائی نے جواب دیا" آپ سے جو زنگ لگی تلوار میں نے لی تھی، وہ بہت قیمتی نکلی۔ وہ تلوار چار سو روپے میں بک گئی۔ آپ نے مجھ سے پچھلی بار دو سو روپے چھین لئے تھے۔ اس لئے دو میں نے رکھ لئے۔ یہ باقی دو سو روپے آپ کے ہیں۔"

ڈاکوؤں کا سردار یہ بات سن کر دنگ رہ گیا کہ دنیا میں اتنے ایمان دار اور سچے آدمی بھی ہوسکتے ہیں۔ سردار نے اس سے اس کے گاؤں اور باپ کا نام پوچھا۔ چھوٹے بھائی نے اپنے گاؤں اور باپ کا نام بتا دیا۔ ڈاکوؤں کا سردار پوری بات سن کر اس کے گلے سے لگ گیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا" میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ میں بچپن میں بری صحبت میں پڑ کر چور بن گیا تھا۔ اسی لئے پتا جی نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔ پھر میں ڈاکو بن گیا۔ لیکن اب میری سمجھ میں آگیا ہے کہ میں غلط راستے پر ہوں۔ میں آج سے ڈاکے ڈالنا چھوڑ دوں گا۔ اب میں تمہارے ساتھ گاؤں چل کر رہوں گا اور ماں باپ کی خدمت کروں گا۔"

چھوٹے بھائی سے باپ کے مرجانے کے بارے میں سن کر سردار کو بہت دکھ ہوا۔ پھر سردار نے اپنے ساتھیوں کو بلایا اور کہا" بھائیو، میں آج سے یہ برا کام چھوڑ رہا ہوں۔ اچھا ہوگا کہ تم بھی یہ برا کام چھوڑ دو۔" پھر اس نے لوٹا ہوا دھن ان میں بانٹ دیا۔

دونوں بھائی گاؤں کی طرف چل دیئے۔ ان کی ماں انہیں دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ انہوں نے ساہوکار سے اپنی زمین واپس لے لی اور کھیتی باڑی کرنے لگے۔ اچھی عقل آتے دیر لگتی ہے، مگر برا وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔

■ ■

سوال جواب

مجرم محمد آبادی

ایک لڑکے نے کیا یہ ہم جماعت سے سوال
علم حیوانات میں تم کو تو حاصل ہے کمال

جس کے سر پر پیر ہوں اے مہربانِ با صفا
کون ہے ایسا پرندہ دو مجھے کوئی مثال

یہ پہیلی سن کے اُن کے ہاتھ کے طوطے اُڑے
قابلیت گم ہوئی حالانکہ سیدھا تھا سوال

ہم سبق کی سمت دیکھا کھلکھلا کے ہنس پڑے
آیا تھوڑی دیر میں جب ایک مرکز پہ خیال

ہر پرندے میں یہ پائے جاتے ہیں اے مہرباں
سب کے سر پر، پیر ہیں میں تم کو دوں کس کی مثال

علم حیوانات کے ماہر نے جب حل کر دیا
ہم جماعت سے کیا اُس نے بھی اک سادہ سوال

آپ کو سب ہم جماعت جانتے ہیں آرٹسٹ
کالی پنسل سے ذرا دکھلایئے تو لکھ کے لال

بات تھی معقول لیکن بدحواسی دیکھئے
موجزن ہونے لگا سینے میں بحرِ انفعال

علم حیوانات کے ماہر نے خود حل کر دیا
حل طلب موضوع پر لاحق ہوا جب احتمال

اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتا تھا آرٹسٹ
کالی پنسل لے کے اُس نے جب لکھا کاغذ پہ "لال"

پیارے بچو سوچ کے سائل کا تم دینا جواب
عقل پر ایسا نہ ہو جلدی میں آجائے زوال

کام دیں گی مجرم کی باتیں گرہ میں باندھ لو
خوب اُس پر غور کرنا جب کرے کوئی سوال

تاریخ پارے

ضرورت مند

ایک بار رفیع احمد قدوائی سے ایک اجنبی نے اپنی بیٹی کی شادی کے لئے تین سو روپے کی مدد طلب کی۔ قدوائی صاحب اُس وقت ایک ڈاکٹر دوست کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے اجنبی سے کہا "کل تم اسی وقت یہاں ملو۔ میں روپے کا انتظام کر دوں گا۔"

اجنبی نے درخواست کی "اگر میں وقت پر نہ ملوں تو آپ مہربانی کر کے روپے ڈاکٹر صاحب کے یہاں رکھ دیں۔"

قدوائی صاحب نے جواب دیا۔ "روپے تم مجھ سے ہی لے لینا۔"

اجنبی کے جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے قدوائی صاحب سے شکایتاً کہا "آپ کو میرے پاس روپیہ رکھنے میں عذر کیوں ہوا؟ شاید میں آپ کے بھروسے کے لائق نہیں۔"

قدوائی صاحب نے کہا "یہ بات نہیں ـــــ میں اس شخص کو جانتا ہوں۔ بیٹی کی شادی تو محض ایک بہانہ ہے خود اس کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہے۔ اب مان لو، اگر میں روپے تمہارے یہاں رکھ دوں اور تمھیں یہ بات کسی طرح معلوم ہو جائے کہ اس شخص نے مجھ سے جھوٹ کہا ہے تو ظاہر ہے تم روپے اُسے نہیں دو گے اور وہ بے چارہ شرم کے مارے دوبارہ مجھ سے لے گا بھی نہیں۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ بہر حال ضرورت مند ہے۔ اس لئے اُس کی مدد کرنی چاہیے۔"

نادان خیر خواہ

پنڈت نہرو ایک جلسے میں تقریر کر رہے تھے۔ اتنے میں ڈائس کے پیچھے کچھ شور ہوا۔ لوگ اُچک اُچک کر اُدھر دیکھنے لگے۔ پنڈت جی نے پیچھے مڑ کر دیکھا پھر مجمع سے مخاطب ہوئے "آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ دو آدمیوں کو بٹھانے کے لئے پچیس والنٹیر کوشش کر رہے ہیں۔"

ناتوانی کی سزا

معرّی عرب کا فلسفی تھا۔ وہ گوشت نہیں کھاتا تھا اور جانوروں کو ذبح کرنے کے خلاف تھا۔ ایک بار وہ بیمار ہوا تو حکیم نے علاج میں مرغ کا گوشت تجویز کیا۔ جسے کھانے پر وہ بڑی مشکل سے راضی ہوا۔ لیکن جب پکا ہوا مرغ اس کے سامنے آیا تو وہ زار و قطار رونے لگا۔ اس نے گوشت کی رکابی ایک طرف سرکا دی اور مرغ سے مخاطب ہو کر بولا ـــ "لوگوں نے تجھے کمزور اور ناتواں سمجھ کر ذبح کیا۔ آخر حکیم نے شیر کے بچّے کا گوشت کیوں نہیں تجویز کیا!"

دوسرا پہلو

کسی نے ایک بار ونسٹن چرچل سے کہا "آپ کو اپنی مقبولیت پر اس وقت یقیناً رشک آتا ہو گا جب آپ دیکھتے ہوں گے کہ ہزاروں آدمیوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر آپ کی تقریر سننے کے لئے بے تاب ہے۔"

چرچل نے مسکرا کر جواب دیا "لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی تو ہے۔ کل اگر مجھے پھانسی پر لٹکانے کی سزا دی جائے تو تماشہ دیکھنے والوں کا ہجوم اس سے کہیں زیادہ ہو گا۔"

مشتاق اعظمی

چلتے جاؤ

ایک بار حکیم لقمان سے ایک راہ گیر نے پوچھا "مجھے فلاں جگہ جانا ہے، کتنی دیر میں پہنچوں گا۔۔۔؟"

حکیم لقمان نے کہا "چلتے جاؤ!"

راہ گیر نے سمجھا کہ شاید بوڑھے نے اس کی بات ٹھیک سے نہیں سُنی ہے۔ اُس لیے اُس نے دوبارہ پوچھا۔ "بابا مجھے فلاں جگہ جانا ہے۔ یہاں سے کتنی دیر کا راستہ ہے؟" حکیم لقمان نے پھر وہی جواب دیا "چلتے جاؤ!"

راہ گیر کے پلّے اس بار بھی کچھ نہیں پڑا تو وہ خاموشی سے اپنی راہ پر ہو لیا۔ لیکن ابھی وہ تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ حکیم لقمان نے اُسے پکارا "سنو، تم دو گھنٹے میں پہنچو گے!"

راہ گیر سے نہ رہا گیا۔ اُس نے پلٹ کر پوچھا "بابا یہ بات آپ نے پہلے ہی کیوں نہیں بتائی"

حکیم لقمان نے جواب دیا "پہلے مجھے تمہارے چلنے کی رفتار نہیں معلوم تھی۔ جب تم کچھ دُور چل کر گئے اور میں نے تمہاری رفتار دیکھی تو اندازہ ہو گیا کہ تم دو گھنٹے میں پہنچو گے۔"

کیوں نہیں؟

قدیم رومی سیاست داں مارکس پوری شش کے اعزاز میں ایک بار روم کے عوام نے ایک مجسمہ لگانا چاہا۔

لیکن پوری شش نے اُس کی اجازت نہیں دی۔ اُس نے کہا

"میں نہیں چاہتا کہ آنے والی نسل یہ پوچھے کہ میرے اعزاز میں مجسمہ کیوں لگایا گیا۔ ہاں اگر وہ یہ کہتے کہ میرے اعزاز میں مجسمہ کیوں نہیں لگایا گیا۔ یہ تو خوشی کی بات ہوگی۔"

سخاوت کا نقصان

ایک بار حاتم طائی کے قبیلے پر کسی دوسرے قبیلے نے حملہ کیا۔ حاتم طائی نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے دشمن قبیلے کو شکست دے دی۔ لیکن جب حاتم دشمن سردار کا پیچھا کر رہا تھا تو اُس نے کہا "حاتم تم اپنا نیزہ مجھے دے دو۔" حاتم نے نیزہ اُسے دے دیا۔ اور خود نہتا ہو کر لوٹ آیا۔

حاتم کے ساتھیوں نے جب یہ ماجرا سنا تو انہوں نے کہا "یہ تم نے کیا کیا! اگر دشمن پلٹ کر تم پر وار کر دیتا تو تم کیا کرتے؟" حاتم طائی نے کہا "تمھارا کہنا درست سہی۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ اگر کوئی کچھ مانگ بیٹھے تو اسے کیا جواب دیا جائے؟"

غرور

یونانی فلسفی سینٹ جانس شان و شوکت والی زندگی کے خلاف تھا۔ ایک بار یونان کے ایک امیر کے یہاں اس کی دعوت تھی۔ محل میں قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے وہ ان کو نفرت کے ساتھ پاؤں سے روندتا ہوا جب امیر کے سامنے پہنچا تو امیر کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ سینٹ جانس نے بڑی بے پروائی سے کہا "میں غرور کا سر کچل دینا چاہتا ہوں۔"

امیر نے جواب دیا "لیکن کتنے غرور کے ساتھ۔"

نیک کام

خلیفہ ہارون رشید کی بیوی زبیدہ بیگم ایک دن خادمہ سے اپنی انگلیوں کے ناخن ترشوا رہی تھیں۔ خلیفہ نے دیکھا تو کہا "یہ کام تمھیں جمعہ کے دن کرنا چاہیے تھا۔ جمعہ کا دن بہتر بتایا گیا ہے۔"

بیگم نے کہا "میرے خیال میں، اس میں جمعہ کی قید نہیں ہونی چاہیے۔ ناخن تو کسی بھی دن ترشوائے جا سکتے ہیں۔"

خلیفہ کو اس جواب سے اطمینان نہیں ہوا۔ اُس نے امام ابوحنیفہؒ کو بلوانے کے لئے خادم بھیجا تاکہ اُن سے یہ مسئلہ پوچھا جائے۔ لیکن اتفاق سے امام صاحب موجود نہیں تھے۔ بیگم نے خادم سے کہا کہ وہ اُن کے مدرسہ کے کسی طالب علم کو بلا لائے۔ خادم ایک کم سن طالب علم کو بلا لایا۔ بیگم نے طالب علم سے پوچھا "کیا تم اس مسئلہ پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہو۔ خلیفہ کا کہنا ہے کہ ناخن جمعہ کے علاوہ کسی دن ترشوانا مناسب نہیں۔"

طالب علم نے کہا "مجھے آج ہی پڑھنے کے لئے بٹھایا گیا ہے۔ بھلا میں اس مسئلہ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

بیگم نے پوچھا "اچھا، آج امام صاحب نے تمھیں کوئی سبق پڑھایا ہے یا نہیں؟"

طالب علم نے کہا "جس وقت میں مدرسہ گیا، امام صاحب کہیں باہر جا رہے تھے۔"

بیگم نے پوچھا "جاتے وقت اُنھوں نے کچھ کہا؟"

طالب علم نے جواب دیا "ہاں۔ اُنھوں نے کہا کہ جب تک میں نہیں آتا، تم یہ یاد کرو کہ نیک کام میں دیر نہیں کرنا چاہیے۔"

یہ جواب سن کر بیگم خوش ہو گئیں۔ اُنھوں نے خلیفہ سے کہا "بس مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا ہے۔ میرے سوال کا جواب مل گیا ہے۔"

●●●●●●

ام پالنہ

فرحت قمر

عشرت، نصرت اور مریم تینوں اسکول جاتے تھے

عشرت چھٹی کلاس میں، نصرت تیسری میں اور مریم پہلی میں تھی۔ تینوں کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ روز اسکول جاتے تھے اور اچھی طرح سمجھتے تھے کہ آج کل کے زمانے میں پڑھے لکھے بغیر کام نہیں چلتا

یہ سب کچھ تو خیر ٹھیک تھا۔ مگر صبح سویرے اٹھنا ــــ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر تھی۔

ان کا اسکول صبح کو ساڑھے سات بجے لگتا تھا۔ اماں پانچ

بجے ہی جگانا شروع کر دیتی تھیں۔ ٹھیک پانچ بجے گھڑی کا الارم بجتا۔ جاڑوں کی لمبی راتوں میں تینوں بچوں کی نیند صبح پانچ بجے تک تقریباً پوری ہو چکی ہوتی تھی۔ لیکن سردی میں بستر سے باہر نکلنا گیا ایورسٹ پر چڑھنے سے کم مشکل ہوتا ہے؟ عشرت میاں سپنا دیکھتے ہوتے کہ وہ ایک کرسی پر بیٹھے ہوا میں اڑتے چلے جا رہے ہیں لیکن اسکول کی گھنٹی بجتی اور ان کو اپنا ہوائی سفر ختم کرنا پڑتا۔ اور وہ گھنٹی جو خواب میں اسکول کی ہوتی۔ دراصل گھڑی کا الارم ہوتی تھی۔ وہ جھنجھلاتے اور بستر کے اندر پڑے پڑے ہی سوچتے کہ کاش یہ الارم نہ بجتا! نصرت میاں سپنے میں آئس کریم کی بھری پلیٹ پر حملہ کرنے والے ہی ہوتے کہ ماں کی آواز کان میں پڑتی "ارے کمبخت اٹھو۔ اسکول کو دیر ہو جائے گی۔" مریم کو بھی لحاف کی نرم گرم دنیا سے باہر نکل کر ہاتھ مونہہ دھونا برا کھلتا تھا ——— مگر کیا کیا جاتا۔ اسکول تو جانا ہی ہوتا تھا۔

وہ خواب میں ایک بڑے سے گھر کی مالکن ہوتی اور اس کے بھائی بڑی اچھی اچھی مٹھائیاں اس کے لئے لاتے، مگر اماں کی آوازیں رنگ میں بھنگ ڈال دیتیں۔

روز یہی ہوتا۔ روز سپنوں کے محل ٹوٹتے اور روز صبح اٹھنا پڑتا۔ ایک دن اسکول سے آ کر کھانا کھانے کے بعد تینوں بچے جب چھت پر دھوپ میں کھیل رہے تھے تو انہوں نے صبح اٹھنے کے مسئلے پر باقاعدہ میٹنگ کرنے کی سوچی۔ دری کے ایک ٹکڑے پر تینوں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور اپنے چہروں پر سنجیدگی سمیٹ لی عشرت میاں نے میٹنگ کی کاروائی شروع کرتے ہوئے کہا

"بھائیو اور بہنو:" "نہیں، بہن" "آج ہمیں اس مسئلے کا حل ڈھونڈنا ہے کہ جاڑے کے دنوں میں صبح سویرے اٹھنے سے کیسے بچا جائے۔"

تینوں گردن جھکا کر کچھ سوچ میں پڑ گئے اور پھر مریم ایک دم چونک کر بولی "ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہیں کہ اسکول نو بجے سے لگایا کریں۔"

نصرت میاں کو اس بات میں کچھ جان نظر آئی اور انہوں

نے اپنا تیسری کلاس کا دماغ استعمال کرتے ہوئے کہا "ہاں بھائی، بس یہ ٹھیک ہے ہم سب بچے ایک عرضی لکھیں اور ہیڈ ماسٹر صاحب کو دے دیں"

عشرت ان تینوں میں بڑے تھے اور اپنے کو بڑا سمجھتے بھی تھے۔ دونوں چھوٹے بھائی بہنوں پر وہ اپنے چھٹی کلاس میں ہونے کا رعب ہمیشہ جماتے رہتے تھے۔ اور ان کی غلطیوں کو پکڑنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ یہ بات اور تھی کہ کسی مشکل کا حل ان کے چھٹی کلاس کے دماغ سے بھی مشکل سے ہی نکلتا۔ ہیڈ ماسٹر کو عرضی دینے کی بات سن کر انہوں نے ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمارے اسکول میں ایک بجے سے دوسرا اسکول بھی تو شروع ہوتا ہے۔ ٹائم نہیں بدلا جا سکتا۔"

بات ٹھیک ہی تھی۔ اس لئے کوئی کچھ نہیں بولا۔ نصرت میاں نے کچھ سیکنڈ کے بعد "پھر"؟

تینوں کی گردنیں ایک بار پھر جھک گئیں اور اب کی بار پہلے جس نے اپنی گردن اٹھائی وہ تھا نصرت اس نے کہا "کیوں نہ گھڑی خراب کر دی جائے؟"

"اس سے کیا ہوگا؟" عشرت نے بات کو نہ سمجھتے ہوئے پوچھا

"تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے" نصرت نے عشرت کے بڑے پن پر چوٹ کرتے ہوئے کہا "گھڑی خراب ہو جائے گی تو صبح کو الارم نہیں بجے گا اور الارم نہیں بجے گا تو . . ."

"جھنا اٹھنا نہیں پڑے گا" مریم نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

میٹنگ ختم ہوتی دکھائی دینے لگی، جیسے ساری مشکل حل ہو گئی ہو۔ مگر ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ صرف ایک ترکیب سوجھی تھی بالکل ایسی ہی ترکیب جیسے چوہوں نے بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کے بارے میں سوچی تھی۔ ابھی تو کئی سوال تھے۔ گھڑی کیسے خراب کی جاتے؟ کون خراب کرے؟ اور ــــ اور ــــ پھر یہ بات

"یہاں تو آ گئے اب واپس کیسے جائیں گے؟"

بھی چھپی کیسے رکھی جاتے؟

عشرت نے کھڑے ہوتے ہوئے دونوں بچوں کو بٹھایا اور کہا یہ مریم جی جو ہیں یہ سارا بھانڈا پھوڑ دیتی ہیں۔ ساری باتیں اماں کو بتا دیتی ہیں۔ گھڑی خراب کرنے کی بات بتا دی تو ٹھکائی ہماری ہو گی۔"

"نہیں نہیں۔ میں کچی کو نہیں بتاؤں گی۔" مریم نے کہا۔

"تم تو ایسی ہی کہتی ہو ہر بار اور پھر اماں کو بتا بھی دیتی ہو" نصرت بولا۔

"میں کہاں بتاتی ہوں"

"ہوں ــــ بتاتیں نہیں اس دن جو ہم نے حلوا نکال کر کھایا تھا"

"مریم نے نصرت کی بات کاٹ کر کہا" تو ہم کو تھوڑا سا

کیوں دیا تھا؟"

"ہیں ـــــ تھوڑا دیا تھا، سب سے زیادہ تو دیا تھا۔"

نصرت بولے۔

عشرت میاں نے دیکھا کہ اب جھگڑا شروع ہو گیا ہے اور جلد ہی باتوں کی بجائے ہاتھوں سے ہونے لگے گا، اس لئے انہوں نے دوسری ترکیب اپنائی۔

"اچھا بھئی دیکھو۔ گھڑی تو میں خراب کر دوں گا لیکن کوئی بھی اماں کو یہ بات نہیں بتائے گا ـــ اور مریم کو ہم کل اسکول میں پانچ مٹھائی کی گولیاں دلائیں گے ـــــ اب کہو! بتاؤ گی تو نہیں اماں کو؟"

"بالکل نہیں بتاؤں گی۔" مریم نے وعدہ کیا۔

"بتاؤ گی تو تمہیں بھی تو سزا ملے گی۔" نصرت نے یہ بات کہنا بھی ضروری سمجھا۔

بات طے ہو گئی اور میٹنگ ختم ہو گئی۔ مریم اور نصرت کھیلنے میں لگ گئے اور عشرت میاں ایک کونے میں کھڑے ہو کر دور دور تک پھیلے ہوئے مکانوں کی چھتوں کو تکتے تکتے یہ سوچنے لگے کہ گھڑی خراب کیسے کی جائے؟"

پہلے گھڑی کو کھولا جائے۔ مگر کیسے؟

"گرا دیا جائے؟ نہیں ـــ اس طرح تو شیشہ وغیرہ ٹوٹ جائے گا۔ آواز ہوگی اور پکڑے جائیں گے۔

عشرت میاں کے دماغ میں بہت سی ترکیبیں ابھرتی ہیں اور وہ خود ہی ان کو غلط سمجھ کر چھوڑتے رہے اور پھر دو ایک منٹ کی مغز ماری سے انہیں ایک آسان سی ترکیب سوجھ ہی گئی۔ انہوں نے گھڑی کی صفائی ہونے اور دھول کی وجہ سے رک جانے کی بات کئی بار سنی تھی۔

اس لئے سوچا کہ بند کی بند گھڑی میں تھوڑی سی ریت پچھلے ڈھکن میں بنے ہوئے سوراخ سے ڈال دی جائے۔

موقع ملتے ہی چٹکی بھر ریت کو گھڑی کے اندر پہنچا دیا گیا۔

گھڑی واقعی بند ہو گئی۔

سب مزے سے سو گئے ـــ انہیں اس بات کی کیا پروا ہوتی کہ ان کے سو جانے کے بعد ماں نے گھڑی میں چابی دیتے وقت گھڑی کو کتنا ہلایا جلایا اور گھڑی ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے صبح کو اٹھنے کی کتنی فکر رہی۔ ان تینوں کو تو اگلی صبح ایک گھنٹہ بستر میں زیادہ دبکے رہنے کا موقع مل ہی گیا۔ لیکن جب اماں نے دیکھا کہ اس دن بچے الٹ پلٹ تیار ہو کر اسکول گئے تو ان کو اگلی رات فکر ہو گئی اور جب کسی بات کی فکر ہوتی ہے تو دماغ سوتے میں بھی کام کرتا ہے۔ ماں بھی اس رات صبح کے چار بجے ہی ہڑبڑا کر اٹھ گئیں گھڑی نہ ہونے کی وجہ سے انہیں پتہ نہ چل سکا کہ بجا کیا ہے۔ انہوں نے تینوں بچوں کو بھی اسی وقت بستر سے باہر نکال لیا یہ اور بات ہے کہ اس صبح جلدی اٹھ جانے کا پتہ اس وقت لگا جب ناشتہ کر کے کپڑے پہن کر تینوں تیار ہو گئے مگر سورج نہ نکلا۔

کئی دن یہی معمول چلا۔ تینوں کو کبھی چار بجے اٹھنا پڑا کبھی ساڑھے چار بجے۔ تینوں کو ہی گھڑی خراب کر کے پچھتانا پڑا۔ اس لئے پانچویں دن اسکول جاتے ہوئے نصرت میاں نے اپنے دل میں مچلتی ہوئی بات کہہ ہی ڈالی۔

"بھیا ـــــ گھڑی خراب کر کے تو اور مصیبت آ گئی۔"

عشرت میاں اس بات پر کچھ نہیں بولے۔ ہاں مریم نے ہاتھ نچا کر ضرور کہا "اچھا کرو گے تو اچھا ہی ہوگا۔"

گھڑی ٹھیک ہو کر آ گئی تو تینوں بچوں نے چین کا سانس لیا۔ انہوں نے سوچا، چلو، چار بجے کے مقابلے میں تو پانچ بجے اٹھنا ہی ٹھیک ہے۔ ■■

صبح کے بھولے

م، ع، غم

صبح کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ گورنمنٹ کالج کے لڑکے کالج کے احاطے میں بکھرے ہوتے دھوپ سینک رہے تھے بارہویں جماعت کے "اے" سیکشن کے آٹھ دس لڑکے گیٹ کے قریب کھڑے اپنے ایک ہم جماعت فیروز کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ فیروز ایک غریب لڑکا تھا۔ وہ پڑھنے میں کافی ہوشیار تھا۔ وہ پچھلے ایک ہفتے سے کالج نہیں آرہا تھا۔ جوان اور ہنس مکھ کلاس ٹیچر عمران صاحب حاضری لینے کے بعد روز لڑکوں سے فیروز کے بارے میں پوچھتے لیکن کوئی بھی فیروز کے کالج نہ آنے کی وجہ نہیں جانتا تھا اور کل اچانک لڑکوں کو پتہ چلا کہ ایک روز قبل چوک میں ایک جنرل مرچنٹ کی دوکان پر چوری کرنے کے جرم میں فیروز کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔ لڑکوں نے پہلے ہی پیریڈ میں یہ خبر عمران صاحب کو سنا دی۔ عمران صاحب پہلے پیریڈ میں انہیں انگریزی پڑھاتے تھے لیکن فیروز کی گرفتاری کا سُن کر بغیر پڑھائے کلاس سے چلے گئے۔ دوسرے دن لڑکوں کو پتہ چلا کہ عمران صاحب فیروز کو ضمانت پر چھڑانے گئے تھے۔

اس وقت سب ہی لڑکوں کو فیروز پر طیش آرہا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ فیروز جیسے نالائق لڑکے کو کالج سے نکال دینا چاہیئے اور انہیں یقین تھا کہ ہوگا بھی یہی۔ پرنسپل صاحب فیروز جیسے بدچلن لڑکے کا وجود کالج میں ہرگز برداشت نہیں کر سکیں گے۔

ابھی اِنٹر کلاس کے لڑکے فیروز کے خلاف غصّے میں بھڑک ہی رہے تھے کہ گیٹ پر ایک کار آکر رُکی۔ یہ لڑکوں کی جانی پہچانی کار تھی۔ عمران صاحب روز اسی کار پر کالج آتے تھے۔ ان

دل اور پھیپھڑے بالکل نارمل ہیں۔

کے ساتھ ایک بوڑھے باوردی پولیس آفیسر بھی ہوتے تھے جو عمران صاحب کو چھوڑ کر کار پر آگے چلے جاتے تھے۔ آج بھی کار کی پچھلی سیٹ پر عمران صاحب اور وہ پولیس آفیسر بیٹھے تھے۔ لیکن لڑکوں کے لئے انہونی بات یہ تھی کہ کار کی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر فیروز بیٹھا تھا۔ عمران صاحب اور فیروز کار سے اترے۔ جب عمران صاحب گیٹ میں داخل ہوئے تو لڑکوں نے انہیں سلام کیا۔ عمران صاحب نے ہمیشہ کی طرح مسکراتے ہوئے جواب دیا فیروز اپنی کتابیں سنبھالے اور نظریں جھکائے ہوئے ان کے پیچھے چلتا ہوا کالج کے اندر چلا گیا۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے لڑکے اس انوکھے واقعے کے بارے میں طرح طرح کے اندازے لگانے لگے۔

تھوڑی دیر میں کالج کی گھنٹی بج اٹھی۔ احاطے میں موجود لڑکے کالج کی عمارت میں داخل ہونے لگے۔ "اختر" لے "کے لڑکے بھی اپنی کلاس میں آکر بیٹھ گئے۔ چند لمحوں کے بعد عمران صاحب اور فیروز کلاس میں داخل ہوتے اور سب لڑکے تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے۔ عمران صاحب نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرکے حاضری کا رجسٹر کھول لیا۔ فیروز بھی اگلی قطار میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ عمران صاحب حاضری لینے لگے اور لڑکے حاضری بولنے کے ساتھ ساتھ فیروز کو گھورتے رہے۔ اس کے بعد عمران صاحب نے رجسٹر بند کرلیا اور کھڑے ہوکر لڑکوں سے مخاطب ہوئے۔

"تم لوگوں کو معلوم ہی ہے کہ پرسوں فیروز کو چوری کے جرم میں پولیس نے گرفتار کرلیا تھا۔ لیکن شاید تم پوری بات نہ جانتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم فیروز کی زبانی سارے حالات سن کر کوئی فیصلہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ غلط فہمی کا شکار ہو کر تم لوگ فیروز سے نفرت کرنے لگو۔"

عمران صاحب کے اشارے پر فیروز نے کھڑے ہو کر کہنا شروع کیا "میرے والد کا انتقال اس وقت ہوگیا تھا جب میں دس سال کا تھا۔ میری ایک چھوٹی بہن ہے جو ساتویں جماعت میں پڑھتی ہے۔ ہماری ماں نے کڑھائی، بُنائی اور سلائی کرکرکے ہمیں پالا تھا۔ چھ مہینے پہلے ہماری ماں بیمار پڑیں۔ گھر میں جو تھوڑے بہت پیسے تھے۔ ان کے علاج پر خرچ ہوگئے۔ لیکن وہ اچھی نہ ہوسکیں۔ ماں کے بعد کوئی سہارا دینے والا نہ رہا۔ میں نے چھوٹے درجے کے لڑکوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کردیا اور کسی نہ کسی طرح اپنا اور بہن کا گزر کرنے لگا۔ ایک ہفتہ ہوا کہ میری بہن کو نمونیہ ہوگیا دو ایک روز کے علاج کے بعد میں پریشان ہوگیا۔ نہ تو بہن کی بیماری دور ہوئی اور نہ ہی میرے پاس علاج کے لئے پیسہ رہا۔ مجبور ہوکر پرسوں دوپہر کو میں نے ایک جنرل اسٹور سے کچھ نقدی چرانے کی کوشش کی اور دوکان کے مالک نے جو دوکان کے ہی ایک حصے میں موجود تھا۔ دیکھ کر مجھے پولیس کے حوالے کردیا۔" یہ کہتے ہوئے فیروز کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"تو یہ ہے فیروز کی کہانی۔" عمران صاحب فیروز کے بیٹھنے کے بعد بولے "اب تم لوگ اپنی رائے دو۔"

"جناب میرے خیال میں فیروز نے سخت جرم کیا ہے۔ اس سے ہمارے کالج کی بھی بدنامی ہوتی ہے۔" اختر نے کھڑے ہوکر کہا

"فیروز کو کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے۔" شرملا نے کہا۔
"فیروز کو کالج سے نکال دینا چاہیے تاکہ دوسرے لڑکوں کو عبرت حاصل ہو۔" وحید نے کہا۔

"لیکن میرا خیال تم لوگوں سے الگ ہے۔" عمران صاحب لڑکوں کو بیٹھنے کا اشارہ کرکے بولے "دنیا میں ان گنت لڑکے فیروز جیسے ہوتے ہیں۔ ان میں سے جس کسی کو صرف سزا کے ذریعے سدھارنے کی کوشش کی جاتی ہے، وہ عام طور سے بگڑتا چلا جاتا ہے لیکن جس لڑکے کو ہمدردی کے ساتھ سہارا دیا جاتا ہے، وہ سُدھر جاتا ہے۔ فیروز نے واقعی غلطی کی ہے لیکن اسے اتنی بڑی سزا نہیں دینی چاہیے۔" میں فیروز ہی کی طرح کے ایک لڑکے کی کہانی جانتا ہوں۔ شاید دس برس پرانی بات ہے وہ لڑکا دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس کے والدین بھی نہیں تھے۔ اس کے بھی ایک چھوٹی بہن تھی جو آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ اس کے حالات بھی بالکل فیروز جیسے تھے۔ اس کی بہن بھی ایک بار سخت بیمار پڑی اور اسے بھی بہن کی محبت نے چوری کرنے پر مجبور کیا۔ لیکن وہ دن کے اُجالے میں کسی دوکان پر چوری کرنے نہیں گیا بلکہ رات کے اندھیرے میں وہ ایک بنگلے کے احاطے میں گھس گیا۔ نچلی منزل کی صرف ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی کھڑکی زیادہ اونچائی پر نہیں تھی۔ لڑکا آسانی سے اس پر چڑھ گیا۔ لیکن وہ ابھی کھڑکی پر ہی تھا کہ بنگلے کا رکھوالا ادھر آ نکلا۔ اس نے لڑکے کو پکڑ لیا۔ اپنے مالک کو جگا کر رکھوالے نے لڑکے کو ان کے سامنے پیش کر دیا۔ قسمت کی ستم ظریفی دیکھو کہ مالک بھی کون نکلا، ایک پولیس سپرنٹنڈنٹ! سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ڈپٹ کر لڑکے سے بات کی تو اس نے اپنے بارے میں سب کچھ اگل دیا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب فوراً ہی باہر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ جب وہ لڑکے کو لے کر چلنے لگے تو لڑکا ڈر سے کانپنے لگا۔ وہ رو رو کر ان سے معافی مانگنے لگا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے اسے سمجھایا کہ وہ اسے

وقت گزارنے کا آسان طریقہ

بند کرنے نہیں جا رہے ہیں۔ اور واقعی وہ اسے کوتوالی نہیں لے گئے وہ اسے اپنی کار پر لے کر ایک ڈاکٹر کے مکان پر گئے۔ ڈاکٹر کو ساتھ لے کر وہ لڑکے کے مکان پر پہنچے۔ ڈاکٹر نے لڑکے کی بہن کو دیکھا بھالا اور دوائی دے کر جانے لگا تو سپرنٹنڈنٹ صاحب نے اسے اگلے روز خود آکر لڑکی کو دیکھ جانے کی تاکید کی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کافی دیر تک لڑکے کو تسلی دینے اور آئندہ کوئی غلط قدم نہ اٹھانے کی نصیحت کرنے کے بعد چلے گئے۔ اس کے بعد وہ روز لڑکے کے مکان پر آنے لگے۔ جب تک لڑکے کی بہن اچھی نہیں ہو گئی، ڈاکٹر بھی آتا رہا۔ ڈاکٹر کا سارا خرچ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے برداشت کیا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب اپنے گھر میں اکیلے تھے۔ بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ ایک روز انہوں نے لڑکے سے کہا کہ وہ اور اس کی بہن ان کے ساتھ ان کے بنگلے میں جا کر رہیں۔ وہ انہیں اپنی اولاد کی طرح پالیں گے۔ لڑکا ان کی مہربانیوں کے لیے احسان مند تھا۔ وہ خود بھی ان سے محبت کرنے لگا تھا۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ صاحب کے بنگلے پر چوری کی نیت سے جانے کے لیے پچھتاتا بھی رہا تھا۔ اب
وہ اپنے بل بوتے پر کچھ بننا چاہتا

باپ رے۔ یہ تو ٹی کی بجائے پاپلکا

تھا۔ اس نے اپنے دل کی بات سپرنٹنڈنٹ صاحب سے کہہ دی
انہوں نے لڑکے کے ارادوں کو پسند کیا۔ انہوں نے لڑکے سے
کہا کہ جب وہ ایمان داری کی راہ پر چل کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے
تو ان کے ساتھ رہنے لگے۔ انہوں نے لڑکے کو ایک بڑی دوکان پر
شام کو دو گھنٹے کا لکھا پڑھی کا کام دلایا۔ ساتھ ہی وہ لڑکے اور
اس کی بہن کی نگہداشت بھی کرتے رہے۔ کئی سال گزر گئے۔
سپرنٹنڈنٹ صاحب کا تبادلہ ایک دوسرے شہر ہو گیا۔ جہاں سے
وہ برابر لڑکے کو خط بھیجتے رہے۔ بہن نے دسویں جماعت پاس
کر کے پڑھنا چھوڑ دیا۔ لڑکا پڑھتا رہا۔ جیسے جیسے اس کا علم بڑھتا
جا رہا تھا ویسے ویسے اس کی آمدنی بھی بڑھ رہی تھی۔ آخر اس نے
ایم۔ اے کر لیا۔ پھر اس نے ایک اچھے گھرانے میں اپنی بہن کی
شادی طے کر دی۔ اس کے بعد وہ بہن کو لے کر سپرنٹنڈنٹ صاحب
سے ملنے گیا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب لڑکے کی کامیابی پر بہت خوش
ہوئے۔ وہ لڑکے اور اس کی بہن کے ساتھ ان کے شہر گئے اور
اپنی سرپرستی میں انہوں نے لڑکی
کی شادی کر دی پھر وہ لڑکے کو
لے کر اپنے شہر لوٹ آئے۔ لڑکے نے ایک کالج میں ملازمت کر لی
اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ساتھ آرام سے رہنے لگا۔"

عمران صاحب ایک پل کے لئے رُکے، پھر بولے "میں نے
فیروز کو پرنسپل صاحب کے سامنے پیش کیا تھا۔ فیروز نے معافی
مانگ کر آئندہ کوئی غلط کام نہ کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ پرنسپل صاحب
نے فیروز کے لئے ماہوار وظیفہ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں
فیروز کو کالج کے بعد فرصت کے وقت میں تھوڑی دیر کی نوکری
دلوادوں گا تاکہ وہ اپنی بہن کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزار سکے
میری سنائی ہوئی کہانی کے سہارے تم لوگ ایک بار پھر سوچو کہ فیروز
کے لئے یہ سب کرنا مناسب ہے یا نہیں؟ وہ کالج میں تم لوگوں
کے ساتھ بھائیوں کی طرح پڑھ لکھ کر ایک اچھا انسان بننے کی
کوشش کرے یا اسے کالج سے نکال کر در بدر کی ٹھوکریں کھانے
پر مجبور کیا جائے؟"

" جناب میں نے فیصلہ کرنے میں غلطی کی تھی۔ فیروز کے لئے
جو کچھ آپ نے اور پرنسپل صاحب نے طے کیا ہے، وہی مناسب ہے"
اختر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہم وعدہ کرتے ہیں کہ فیروز کو ہمیشہ اپنا دوست سمجھیں
گے۔" شرما نے کہا۔

"لیکن جناب وہ لڑکا کون تھا جو چور بنتے بنتے ایک کالج
کا ماسٹر بن گیا؟" وحید نے پوچھا۔

عمران صاحب نے پوری کلاس پر نظر دوڑائی۔ لڑکوں کی
آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ اس لڑکے کی حقیقت جان چکے ہیں۔
لیکن پھر بھی عمران صاحب کی زبان سے سننا چاہتے ہیں۔ عمران صاحب
مسکرائے۔ پھر ان کے ہونٹ ہلے اور لڑکوں نے اپنے یقین کے
مطابق ان کا جواب سنا۔

" وہ لڑکا اس وقت تمہارے سامنے تمہارے کلاس ٹیچر
کی شکل میں موجود ہے۔"

●●

پیار کے نام سے بیزار ہیں باجی پاجی
صرف غصّے کی پرستار ہیں باجی پاجی
سچ ہے یہ بات کہ بیکار ہیں باجی پاجی
اپنی سکھیوں میں تو گلزار ہیں باجی پاجی
ہم سے پھولوں کے لئے خار ہیں باجی پاجی

مُنہ جو ہنس ہنس کے چڑھا لینے کا پہلو نکلے
اور کچھ ہم کو بنا لینے کا پہلو نکلے
مار پاپا سے پٹا لینے کا پہلو نکلے
جس میں کچھ ہم کو ستا لینے کا پہلو نکلے
ایسی ہر بات پہ تیار ہیں باجی پاجی

ماردیں پائیں جو سوغات وہ ہم بچوں کی
کھاتی ہیں ٹافیاں ہر رات وہ ہم بچوں کی
کچھ سمجھتی نہیں اوقات وہ ہم بچوں کی
کاٹ دیتی ہیں ہر اک بات وہ ہم بچوں کی
ایسی چلتی ہوئی تلوار ہیں باجی پاجی

دن میں بازار بھی جاتی ہیں کئی بار مگر
اور ہنستی ہیں ہنساتی ہیں کئی بار مگر
ہم کو آنکھیں بھی دکھاتی ہیں کئی بار مگر
کودتی پھرتی ہیں کھاتی ہیں کئی بار مگر
کام کے نام پہ بیمار ہیں باجی پاجی

رات ہو، دن ہو ہمیں ڈانٹتی ہی رہتی ہیں
سخت اور سست وہ ہر وقت ہمیں کہتی ہیں
اور کسی بات کا نوٹس ہی نہیں لیتی ہیں
ہم کو سچ بولنے کا روز سبق دیتی ہیں
اور خود جھوٹوں کی سردار ہیں باجی پاجی

ٹافیاں بانٹنے والا بھی نہیں ہے کوئی
اور اب مارنے والا بھی نہیں ہے کوئی
بات کو کاٹنے والا بھی نہیں ہے کوئی
اب ہمیں ڈانٹنے والا بھی نہیں ہے کوئی
آٹھ دن ہو گئے بیمار ہیں باجی پاجی

راہ نما

انسان کو روزمرہ کی زندگی میں جن چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان کو کتاب راہ نما میں قرآنی آیات کے اُردو ترجموں سے سچی رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے ـــــ قیمت : تین روپے

اولیاء اللہ کے سات سو سالہ تبلیغی مشن کی مستند تاریخ

خم خانۂ تصوّف (تذکرہ اولیاء ہند و پاک)

ڈاکٹر ظہور الحسن شارب ایم اے ایل ایل بی پی ایچ ڈی

اولیاء اللہ نے ہندوستان میں اسلام کیوں کر پھیلایا؟ بلا امتیاز مذہب و ملت ہندوستان کے افراد کو کیسی فراخ حوصلگی سے فیض پہنچایا۔ اولیاء کرام کی کرامتوں، ملفوظات اور پاک زندگی کا بیش بہا خزانہ ہے۔

صفحات تقریباً چھ سو۔ سائز ۱۸×۲۲/۸، عمدہ سفید کاغذ، عکسی طباعت۔ قیمت دس روپے

میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے سچی رہنمائی حاصل کیجئے۔

بہترین کتابت، رنگین طباعت، عمدہ کاغذ، دیدہ زیب ٹائٹل۔ فوٹو آفسیٹ کے ذریعے چھاپی گئی۔ قیمت : دو روپے

قرآن اور عورت

قرآن کریم نے عورت کو قعرِ ذلت سے نکال کر کس طرح اس کے حقوق کی حفاظت کی، کن کن فرائض کی ادائیگی کے لئے اس کو تنبیہ کی اور اسلام میں عورت پر کیا کیا احکام صادر کئے یہ سب جاننے کے لئے قرآن اور عورت کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

قیمت : ایک روپیہ ۵۰ پیسے

کتاب الطہارت

اسلام روحانی اور جسمانی پاکیزگی کا علم بردار ہے۔ دلوں کی پاکی کے ساتھ جسم کی پاکی بھی بہت ضروری ہے کیوں کہ جسم کی پاکی کے بغیر کوئی عبادت مقبول نہیں ہوتی۔ اس کتاب میں جسمانی پاکی حاصل کرنے کے طریقے، آداب اور اعمال نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ مومن جب غسل اور وضو کے جملہ آداب کا لحاظ کرکے بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز ہوتا ہے تو فرشتے خدا کی رحمت کا تحفہ لے کر نازل ہوتے ہیں

قیمت : ۷۵ پیسے

مکتبہ دینیات آصف علی روڈ نئی دہلی نمبر ۱

منّی کی مچھلیاں تالاب میں سے نکل کر کہیں غائب ہو گئی ہیں۔ کیا تم تلاش کر کے بتا سکتے ہو وہ کتنی ہیں۔

شمع ادبی معمہ نمبر ۱۲۲

۳	■	ت		۲	■	ر	ت		۱ ب
و	۵	■	ی	ت	ک		۴	■	ے
		■	ل			۷ م	■	۶	
ے	ا	۱۰	■		۹ ک	■	۸	ا	
■	■	ہ					و		■
■	۱۱	ا					کھ	■	■
۱۵ ا	ا	ن	■		۱۴ ا	■	ی	۱۳ ا	۱۲
	ل	■	ے	ن	ا	۱۶	■		
	■	ے	ن		و	۱۷	■	ل	ت
ے	ت		۱۹	■	ک		۱۸	■	ے

Rs. 1,00,000 ایک لاکھ روپے کے انعامات

پہلا انعام بالکل درست حل پر: پچاس ہزار روپے

دوسرا انعام: ایک غلطی والے حل پر: تیرہ ہزار روپے تیسرا انعام: دو غلطی والے حل پر: بارہ ہزار روپے چوتھا انعام: تین غلطی والے حل پر: گیارہ ہزار روپے خصوصی انعام: چودہ ہزار روپے پہلا، دوسرا، تیسرا اور چوتھا انعام پانے والے حلوں میں سے سب سے پہلے ڈاک سے آنے والے چار چار حلوں پر تقسیم کیا جائے گا۔ فیس داخلہ فی حل: ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ شمع ادبی معمہ نمبر ۱۲۱ کے اپنے تمام خانوں کے ساتھ ایک کوپن شمع ادبی معمہ نمبر ۱۲۲ ضرور بھیجئے جو ماہنامہ شمع (نئی دہلی) سے کاٹا گیا ہو۔ مفصل شرائط اور ہدایات ماہنامہ شمع (نئی دہلی) میں شائع کی جاتی ہیں، ان کی پابندی ضروری ہے —— ایک شخص الگ الگ کوپنوں پر الگ الگ انعام حاصل کر سکتا ہے۔

دفاتر شمع میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ: ۱۰- مارچ ۱۹۷۳، بارہ بجے رات تک

اشارے

دائیں سے بائیں

۱- ہم بغیر سوچے سمجھے، بغیر پرکھے اور جانے یہ راگ کیوں الاپنے لگیں کہ یورپ اور امریکہ، روس اور جاپان کی ہر چیز ہمارے یہاں سے —— ہے۔ بلند سے اعلےٰ ورا رفع ہے

۲- صرف تمہاری —— سے ڈرتا ہوں ورنہ مجھے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینا آتا ہے

۴- مسجدوں خانقاہوں میں موت مل سکتی ہے زندگی نہیں۔ زندگی —— ہے گندی جھونپڑیوں میں جگمگاتے عشرت کدوں میں

۷- زندگی کو ایک —— کتاب تو کہا جا سکتا ہے لیکن یہ ایسی کتاب ہے جسے بیچ میں کوئی چھوڑ نہیں سکتا

۹- آج —— سائنسدان دوسری دنیاؤں تک پہنچنے کے قابل عمل منصوبے بنانے میں مصروف ہیں

۱۴- میں اکیلا ہی دنیا میں آیا تھا اور —— ہجوم میں بھی اپنے آپ کو اکیلا ہی محسوس کرتا ہوں

۱۶- والیشیا کا لفظ اس کیلئے بھی گالی ہے جس کے پاس نوٹوں کے انبار ہوں اور اس کیلئے بھی یہ گالی ہے جس کے پاس زہر —— کو بھی پیسے نہ ہوں

۱۷- زیادہ —— والوں کیلئے موضوع کی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ تو بس اپنی دھن میں رہتے ہیں

۱۸- عورت کی چھپی ہوئی سسکیاں گرم راکھ کے نیچے دبی چنگاریوں کی طرح ہوتی ہیں۔ نہ جانے کب ہوا لگے اور شعلے —— اٹھیں

۱۹- ایک اپ ٹو ڈیٹ نوجوان کہتا ہے کہ "جب تک کسی کی ماں زندہ ہے، وہ بالغ ہونے کے بعد بھی کمسن ہوتا ہے" —— اُدب سے نیچے

۱- چار چار دن کے فاقوں سے —— ہو کر روٹی چرانے والے غریب ہیں اور ہزاروں ماہانہ کمانے کے باوجود رشوت لینے والے "اعلیٰ عہدے دار"

۳- اس مجبور عورت کے آنسو نہ بہہ سکیں گے لیکن اسکا دل ضرور —— گا اور ہو سکتا ہے اسکی مایوسیاں اسے خودکشی پر آمادہ کر دیں

۵- جو شخص کائنات کو محض مادے کے تغیر و تبدل کا نتیجہ سمجھے اور کسی خالق اعلیٰ کو تسلیم ہی نہ کرتا ہو اسے —— کا خوف کیسا؟

۶- پتہ چلتا ہے کہ —— ہزار برسوں کے تہذیبی دور میں انسان نے اخلاقی نقطۂ نظر سے کچھ ترقی نہیں کی

۸- کیا تعجب ہے کہ لوگ —— روٹی اور دال چٹنی پر قناعت نہیں کرتے

۱۰- غریبوں کو دبا کر ظالم اور جابر انسان آگے بڑھتے ہیں۔ یہی —— کا دستور ہے

۱۱- یہی ایک خیال مجھے اس بہت بڑی اونچائی پر پہنچنے کی خوشی سے محروم کئے ہوتے ہے کہ کہیں یہ سب ایک —— نہ ہو

۱۲- جو قدم قدم پر —— ہیں وہ کبھی زندگی کی مہم سر نہیں کر سکتے

۱۳- عورتیں روز —— سے مظلوم رہی ہیں۔ اور مردوں کے مظالم کا تختۂ مشق بنتی رہی ہیں

۱۵- دیکھ لینا جنکو —— قریب سمجھتے ہو وقت پڑنے پر وہی ساتھ چھوڑ دینگے۔ کام آئینگے تو یہ پرانے غمگسار

■ ■

ڈاک سے اپنے حل اور فیس اس پتے پر بھیجئے: **"شمع ادبی معمہ نمبر ۱۲۲، ماہنامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱"**

شمع ادبی معمہ نمبر ۱۲۲ کا صحیح حل: ۱۳- مارچ ۱۹۷۳ کو صبح نو بجے ظاہر کیا جائے گا۔ ۷- اپریل ۱۹۷۳ تک تمام انعامات ادا کر دئے جائیں گے۔

ڈاکو : (ایک صاحب کے سینے پر پستول رکھ کر) "جان دیتے ہو یا پیسہ؟"

ساہوکار : جان لے لو کیوں کہ پیسہ تو میں نے بڑھاپے کے لئے رکھا ہے۔

حسن ضیاء نقوی، امروہہ

ہیڈ ماسٹر : بولو آج کون کون اسکول سے بھاگ گئے ہیں۔

مانیٹر : حسین، بادشاہ، عبداللہ

ایک لڑکا : (اُٹھ کر) سَر نہیں وہ پل کر گئے تھے۔

محمد رؤف، ٹھیکل

ایک بچہ ایک دوکان پر رکھے ہوئے چاندی کے کپ دیکھ رہا تھا، کچھ دیر بعد اس نے ایک کپ ہاتھ میں لے کر دوکاندار سے پوچھا۔

لڑکا : یہ کپ کس کام آتے ہیں؟

دکاندار : جو بچہ دوڑ میں سب سے آگے رہتا ہے اسے یہ انعام دیا جاتا ہے۔

لڑکا : اچھا! تو میں دوڑتا ہوں مجھے پکڑنے کی کوشش کرو یہ کہہ کر وہ کپ لے کر بھاگ گیا۔

نسرین آمنہ، مراد نگر

راہ گیر : (ایک بچے سے) کیا وقت ہوا ہے؟

بچہ : (گھڑی دیکھ کر) بج کر دس

راہ گیر : کیا کہا؟

بچہ : بج کر دس۔

راہ گیر : کیوں مذاق کرتے ہو بیٹا؟

بچہ : جناب دیکھئے نہیں میری گھڑی میں صرف بڑی سوئی لگی ہوئی ہے۔

عبدالصمد، آسنول

مسافر: ارے، ارے، گاڑی روکو ایک عورت ٹرام سے گر پڑی ہے؟
کنڈکٹر: (لاپرواہی سے) کوئی ہرج نہیں جناب اس نے اپنا ٹکٹ لے لیا ہے۔
شیخ محمد عثمان، اورنگ آباد

ڈاکٹر: بخار میں سردی سے تمہارے دانت بجتے ہوں گے۔
مریض: جی نہیں، بخار جب بڑھ جاتا ہے تو میں دانت اتار کر رکھ دیتا ہوں۔
محمد سلیم، گرولیہ پرگنہ

مالک: (نوکر سے) میں تم سے ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ طوطارام کی دکان سے سامان نہ خریدا کرو وہ گاہکوں کی آنکھ میں دھول جھونک دیتا ہے۔
نوکر: حضور اسی لئے جب بھی میں طوطارام کی دکان پر جاتا ہوں آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔
شاہ محمد اصفالدین خرم، خرید انمبر

ایک شیطان لڑکے کی آنکھوں کا امتحان ہو رہا تھا۔
ڈاکٹر نے لڑکے سے کہا: اس چارٹ پر جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھو؟
لڑکے نے اپنے دل میں پڑھ کر کہا "لیجئے پڑھ لیا۔"
ڈاکٹر نے کہا تھا "زور سے"
لڑکے نے پوچھا "کیا بات ہے آپ کو پڑھنا نہیں آتا؟"

رومی: کیا پاپا ہم مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔
پاپا: ہاں بیٹی ہم لوگ مٹی کے بنے ہیں۔
رومی: لیکن جب ہم لوگ نہاتے ہیں تو پھر کیچڑ کیوں نہیں ہو جاتے؟
سلطانہ اقبال، جھپرہ (سارن)

استاد: (نعیم سے) بتاؤ نعیم اگر دو اور دو چار اور چار اور چار آٹھ تو آٹھ اور آٹھ کتنے؟
نعیم: جناب آسان سے آسان سوال تو آپ حل کر لیتے ہیں اور مشکل مجھ سے پوچھتے ہیں۔
ارشاد احمد، بدیرہ، امراؤتی

آشی بھیا

غالب چچا نے یہ شعر،

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے دن ہوں پچاس ہزار

اسی لئے کہا ہوگا تاکہ ہم سب آپ کو درازیِ عمر کے لئے یہی دعا دیں اور اتنے دنوں تک ہم لوگوں کے لئے اچھے اچھے کھلونا نکالتے رہیں۔ خدا کرے میری یہ دعا آپ کو لگ جائے۔ آمین!!

سچ مچ بھیا اس بار کا کھلونا بہت اچھا ہے۔ دل باغ باغ ہوگیا خاص کر افضل امام کی کہانی "ٹیبل لیمپ"، کھلونا کی جان ہے اور اختر علی صاحب بھی آج کل بہت اچھے اچھے مضامین فراہم کرنے لگے ہیں۔ لگتا ہے انہیں مضمون کے سلسلے میں قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے۔ وہ بھی قابل ستائش ہیں۔ کیوں کہ ان کے مضامین نے ہم لوگوں کی معلومات میں کافی اضافہ کیا ہے اور باقی دیگر کہانیاں اور نظمیں بھی خوب ہیں اب آپ ذرا اس مسئلہ پر بھی چند الفاظ گھسیٹ دیں کہ آخر سمندر کا پانی کیوں نمکین ہوتا ہے؟ "راحت بانو طہن" کی کہانی گرچہ خوب ہے مگر اس میں ایک زبردست خامی یہ ہے کہ وہ کہانی کے آخر میں مرکزی خیال "انگریزی سے" لکھنا بھول گئی ہیں۔ جی ہاں۔ اسی قسم کی کہانی "جادو کی ل" کنومینٹ کے کورس میں ہے۔ خیر آئندہ احتیاط برتیں۔ اور جو بات سب سے ضروری ہے وہ تو یہ ہے کہ آپ کھلونا کے سالنامے کا اعلان شائع نہ کیا کیجئے آپ چونکیں گے تو ضرور۔ مگر بھیا۔ آپ کیا جانیں کہ سالنامہ کے انتظار میں کیا گزر رہی ہے ہم پر۔ اعلان دیکھ دیکھ کر تو بےتابی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اب ذرا سالنامہ دیکھ لوں پھر تو زین کی ایک ہوگی مبارک باد سے بھر کر روانہ کروں گی۔ میں سالنامے کی منتظر ہوں اور آپ مبارک باد کا انتظار کریں۔

تبسم نذیر، اریا کورٹ (پونیہ)

الیاس بھائی؛

کھلونا کا نیا شمارہ جنوری ۱۹۷۳ء رجسٹری سے ملا۔ میری کہانی ٹیبل لیمپ کو کھلونا میں جگہ دینے کا بہت بہت شکریہ! میں ان تمام بہن بھائیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے کہانی شائع ہونے کی اطلاع دی اور کہانی پسند کی۔ میں آئندہ بھی کوشش کروں گا۔

اس شمارے کی قریب قریب سب ہی کہانیاں، نظمیں و مضامین پسند آئیں۔ خاص کر تصویری کہانی "سرکس کی کہانی" مضمون میں "کیوی" اور سلام مچھلی شہری کی نظم "نیا سال، گیا سال" بے حد پسند آئیں۔ سالنامہ کا انتظار ہے جو امید ہے کافی شاندار ہوگا۔ افضل امام، کلکتہ،

الیاس بھائی؛

جنوری کا کھلونا ملا۔ کہانیاں بہت ہی دل چسپ اور سبق آموز تھیں جاوید لطیفی کی کہانی "انصاف" مجھ کو بہت ہی پسند آئی۔ میرے خیال میں اس کہانی کا عنوان "انصاف" کی بجائے "سچائی" ہوتا تو بہت ہی مناسب رہتا۔ خواجہ حسین احمد، بنگلور

اچھے بھائی جان:

جنوری کا کھلونا ملا۔ بہت پسند آیا۔ کہانیوں میں افضل امام کی کہانی "ٹیبل لیمپ" اور فیروز بخت کی کہانی بہت پسند آئی ویسے راحت بانو طہن کی کہانی "سمندر کا پانی کیوں نمکین ہوتا ہے" بھی ٹھیک ہے۔ سرکس کی کہانی اچھی ہے۔ تین جاسوس تو آئندہ بھی پڑھنے کو ملتی رہے گی۔ نظمیں بھی سب ٹھیک ہیں۔ یہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ سالنامہ کے بعد آپ ہر مہینہ نیا ٹائیٹل چھاپا کریں گے۔ سالنامہ کا بہت انتظار ہے۔ محمد رفیع، دیوبند

ڈیر بھائی جان:

جنوری کا کھلونا پڑھا۔ بہت پسند آیا۔ نیا ٹائیٹل دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی سارے مضمون اچھے تھے۔ خاص طور سے تین جاسوس، ٹیبل لیمپ، یہ کہانیاں بہت پسند آئیں ساتھ ہی فیروز بخت کی کہانی "کرامتی پنکچر" بہت اچھی ہے۔ نظموں میں خسرو متین خسرو کی "سردی کا موسم" اچھی اور دل چسپ ہے۔
شکیل احمد قریشی، پارسولی

الیاس بھائی؛

جنوری کا کھلونا ملا۔ کتابت اور طباعت عمدہ رہی۔ مضامین بھی قابلِ تعریف ہیں۔ جس کی وجہ سے کھلونا کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ اب کی بار "ٹیبل لیمپ" اور "کرامتی پنکچر" بے حد پسند آئے۔ مگر جاوید لطیفی کی "انصاف" کو ٹھونسنے کی کیا ضرورت تھی جنوری کا ٹائیٹل پرانا ہوتے ہوئے بھی ہمیں بے حد پسند آیا۔ ذکی انور کی کوئی کہانی آپ نے اب تک شائع نہیں کی ہے۔ براہ کرم کھلونا بک ڈپو کی ایسی کتابوں کا اشتہار شائع کیجئے۔ جن کے ایڈیشن موجود ہوں۔ اس سلسلے میں ہمیں کافی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے
شاہ محمد آصف الدین خرم، خریدار نمبر ۲/۶/۵

نتیجہ انعامی تصویر نمبر ۶۷

جنوری کے کھلونا میں ایک انعامی تصویر شائع ہوئی تھی۔ اس کا سب سے اچھا عنوان "کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں": محمد مبصر عالم، سوہ سرائے نے لکھا ہے۔ انہیں دو روپے انعام دیئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ یہ بھی عنوانات بھی پسند آئے: 'نیا کھلاڑی نیا کھیل'، محمد بشیر، مالیگاؤں۔ 'زور لگا کے ہیّا۔ ۔ ۔'، رخسانہ ناظمہ، بمبئی۔ 'کل کا تقدیر'، نجمہ جعفر، بنگلور۔ 'مسکراتا چاند' ابرار حسین، رامپور۔ 'پیٹ پوجا کے بعد' زہرہ نثار، ٹونک۔

نتیجہ تصویری کارٹون نمبر ۶۸

جنوری کے کھلونا میں ایک تصویری کارٹون شائع کیا گیا تھا جس میں بات چیت بھرنی تھی۔ اس میں سب سے اچھی بات: "منّے جلدی چائے پینے سے کوئی فائدہ نہیں، چائے کی پیالی صرف ایک ہی ملے گی۔" کہکشاں انجم، دہلی نے لکھ کر بھیجی ہے۔ انہیں پانچ روپے انعام دیئے جائیں گے۔

نتیجہ تصویری پہیلی نمبر ۴

جنوری کے کھلونا میں جو تصویری پہیلی شائع ہوئی تھی اُس کا صحیح جواب صرف بائیس بہن بھائی دے سکے ہیں۔ اُن میں سے قرعہ اندازی کے ذریعہ دس بہن بھائیوں کو دو دو روپے انعام بھیجے جائیں گے۔

انعام پانے والوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ اقبال احمد، بھوپہ (مظفر نگر) ۲۔ قیصر مسعود بمبئی ۳۔ غلام نبی انجم، دربھنگہ ۴۔ مختار احمد، الیوت محل ۵۔ فخریہ خاتون، بلند شہر ۶۔ ایس. ایم راشد، کلکتہ ۷۔ ایم محمد نذیر، رابرٹ سن پیٹ ۸۔ شفیق احمد، کلکتہ ۹۔ فخرالدین، کلکتہ۔ ۱۰۔ فیضان احمد، رانچی۔

ان کے علاوہ باقی بہن بھائیوں کے نام یہ ہیں:
سیما صبوح، موہنی نرنگی پور۔ دی نرسمہا مورتی، وناپرتھی۔ وحیدہ اصغر، کلکتہ۔ رضوان الدین بھوپال، عبدالرشید، رانی امراوتی

صدیق احمد، مراد آباد۔ نہال احمد، اعظم گڑھ۔ بے بی ناز، بہار شریف۔ فائد اطہر، سَردنج۔ شکیل احمد، پارسوئی۔ شکیل احمد، منجھ پوروہ (فرخ آباد)۔ نسیم احمد، مبارک پور۔

صحیح جواب: کتاب غائب ہے۔

نتیجہ نیا مقابلہ نمبر ۵

جنوری کے کھلونا میں نیا مقابلہ شائع ہوا تھا اس کا صحیح جواب ۲۱ بہن بھائیوں نے بھیجا ہے ان میں سے قرعہ اندازی کے ذریعہ دس بہن بھائیوں کو دو دو روپے انعام بھیجے جائیں گے۔ جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ شیریں، رانچی ۲۔ رافعہ سلطانہ، جھاجھا ۳۔ زہرہ سفیان، ٹونک ۴۔ فرزانہ شاداب، مالیگاؤں ۵۔ سید انجم معراج، مظفر نگر ۶۔ انعام الدین، جمشید پور ۷۔ ساجدہ تبسم، بران ۸۔ صفیہ پروین، کلکتہ ۹۔ رضی الدین، حیدر آباد ۱۰۔ اظہر جمیل، علی گڑھ۔

صحیح جواب لکھنے والے کچھ بہن بھائیوں کے نام یہ ہیں:

نفیسہ ظفر، بمبئی۔ فرخ ظفر، دہلی۔ بجمہ جعفر، بنگلور۔ مختار احمد، الیوت محل۔ حبیبہ، سلطان پور۔ مشتاق احمد، جھاجھا۔ مسعود نذیر، مالیر کوٹلہ۔ اعجاز علی، پٹنہ۔ جاوید اقبال، سہارن پور۔ منصور نثار، کلکتہ۔ وقار احمد، مظفر نگر۔ وسیم احمد، کلکتہ۔ رعنا خاتون، وارانسی۔ محمد نسیم، پیلی بھیت۔ قیصر مسعود، بمبئی۔ محمد معروف، رُدولی شریف۔ بدرالزماں، دیوبند۔ صادقہ راجہ، برہان پور۔ راحت بانو، نئی دہلی۔ رضیہ بانو، بمبئی۔ آصف علی، الیوت محل۔ ناہید تبسم، لکھنؤ۔ خورشید انور، دہلی۔ شکیل انوار، نالندہ۔ اسرار الحق، علی گڑھ۔

صحیح جواب: برف گھلنے کے بعد پانی گلاس سے باہر نہیں گرے گا۔

ادبی بہاریں

دھنک کے ساتوں رنگ پھیل گئے ہیں۔ دور تک پھول ہی پھول کھلے ہوئے ہیں۔
آوازیں زندگی کی ساری دل کشی سمیٹے ابھر رہی ہیں۔
بہار آگئی ہے!
چونکنے کی بات نہیں۔ بہار بے رت کے بھی آتی ہے، اس لئے کہ بہار باہر کی
رنگا رنگ خوب صورتی کا ہی نہیں، دل کی رنگا رنگ امنگوں کا نام بھی ہے۔
یہ سال نامہ آپ سب کے لئے (شاید آپ سے بھی زیادہ اپنے بچپن کی یادوں کو
تازہ کرنے کے رسیا بڑوں کے لئے) ایسی ہی رنگا رنگ امنگوں کے پھول لے کر آیا ہے۔
بہت دن تک یہ آپ کے دلوں میں نئے نئے ولولے جگائے گا، نئی نئی سوجھ بوجھ
عطا کرے گا۔
جی چاہتا ہے کہ اسی لمحے کسی طرح ہمیں معلوم ہو جائے کہ یہ بہار آپ کو
کیسی لگی ہے۔ لیکن ہمیں تھوڑے سے صبر سے کام لینا ہی ہوگا۔ اطمینان سے اسے
پڑھئے ——— اس لئے کہ "بڑے" یہ ہرگز نہیں چاہیں گے کہ آپ ہر وقت
اس بہار میں کھوئے رہیں ——— اور پھر ہمیں لکھئے کہ اس بہار کے کون سے
رنگ آپ کو اچھے لگے اور کون سے رنگ نہیں بھائے۔ آپ کی رائے سے
ہمیں ہی نہیں، آپ کے لئے لکھنے والوں کو بھی بہتر رنگوں کی کھوج میں مدد
اور رہنمائی ملے گی ——— ہمیں آپ کے خط کا انتظار ہے۔

KHILAUNA New Delhi 26th year of Publication ANNUAL 1973
Registered with the Registrar of Newspaper at R. N. No 637/57 Regd. No. D-71